گھروندا ریت کا

(ناول)

سلمیٰ اعوان

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد۔لاہور۔کراچی

انتساب

اپنے بچوں کے نام

+

اُن کے بچوں کے نام

باب نمبرا:

بیوی نے ہاتھ پکڑ کر بٹھانا چاہا پر وہ تو اُسوقت تماشا دکھانے والے مداری کا وہ بندر بنا ہوا تھا جو غُصّے سے بَل کھاتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے سے بندریا کا سر توڑ دینا چاہتا ہو۔نفیس طلائی چوڑیوں سے سجے اُسکے سڈول بازو کو جو اُسے روکنے اور بٹھانے کے لیے آگے بڑھا تھا بیزارگی سے جھٹک کر زہر بھرے لہجے میں بولا تھا۔

''مجال ہے جو تمہارا دماغ کبھی اس تھسن گھیری سے نکل جائے۔زبان ہے تو وہ کمبخت سان پر رکھی ہوئی ہے۔دل گردہ بھی اتنا مضبوط نہیں کہ موقع محل ہی مدنظر رہے۔''

اس نے رُخ پھیرا۔غصیلے چہرے اور سُرخ آنکھوں سے اُسے ایک بار پھر گھورا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

اور وہ جو سُرخ اور سیاہ پھولوں والی راجشاہی سلک کی ساڑھی پہنے شانوں پر بوجھل سا جوڑا ٹکائے بڑی تمکنت سے اپنی سیٹ پر بیٹھی تھی۔اُس نے مُضطرب اور خوف زدہ سی ہو کر اپنے دائیں بائیں اور آگے پیچھے دیکھا کہ کوئی ان کے درمیان ہونے والے اس جھگڑے اور گفتگو کو دیکھ اور سُن تو نہیں رہا تھا۔پر کوئی اُن کی طرف متوجہ نہیں تھا۔کسی نے اُن کی باتوں کا نوٹس نہیں لیا تھا۔

ہال کی Lights بُجھ چکی تھیں اور سکرین پر سینما میں چلنے والی اگلی فلم "The Gold Finger" کا اشتہار دکھایا جا رہا تھا۔وہ قدرے پُرسکون ہوئی اس کے دونوں بچے داہنے ہاتھ کی سیٹوں پر بیٹھے شان کونری کو دیکھ رہے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ ابھی ابھی ماں اور باپ کے درمیان کسی بات پر تُو تُو میں میں ہوگئی ہے اور باپ احتجاجاً اُٹھ کر چلا گیا ہے۔

اس کے دل سے ایک ہُوک سی اٹھی جس نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا! چہرے پر یاس کا رنگ بکھیر دیا۔ لہجے میں درد کو گھول دیا۔ اور جب وہ اپنے آپ سے یہ سب کہتی تھی اُس کی آواز تلخی سے بھری ہوئی تھی۔

اللہ مزاج ہے اِس کا ٹھکانے۔ کیسے اِس خوبصورت شام کا ستیا ناس کر دیا ہے؟ کِس بیدردی سے میرے جذبات پاؤں تلے روند گیا ہے؟ میٹنگ پر جانے سے بھی روکا اور جو تفریح کے لیے لایا اُس کا بھی بیڑہ غرق کیا۔ اُس کی خود کلامی نے اک ذرا توقف کیا پھر سلسلہ جاری ہو گیا۔

اور یہ دل گردے کی مضبوطی بھی خوب رہی۔ میں پُوچھتی ہوں وہ کونسی عورت ہے جس کا شوہر تا کا جھانکی کرتا پھرے اور وہ لبوں کو سیئے بیٹھی رہے۔ اب سچی بات پر تو مرچیں لگنی ہی ہیں اور جو آن، عزت کا اتنا ہی خیال ہے تو آنکھوں کو گنہگار کرنے سے فائدہ۔

بات تو کچھ بھی نہ تھی بس اتنی سی کہ تھوڑی دیر قبل وہ آفس سے گھر آیا۔ گاڑی سے اُتر کر اندر آتے آتے اُس نے کوئی دس بار اُونچے اُونچے ''طاہرہ بھئی کہاں ہو؟'' کی صدائیں لگائیں۔ کچن میں دوپہر کے کھانے کو چیک کرتی طاہرہ بوکھلا کر بھاگی بھاگی لیونگ روم میں یہ کہتے ہوئے آئی۔

''کیا مسئلہ ہے؟'' اتنا کیوں چلاّ رہے ہیں؟

''مسئلہ وسئلہ کچھ نہیں۔'' اُس نے بریف کیس ریک پر ٹکاتے ہوئے کہا۔

''میں 'مدھو میتا' میں میٹنی شو کے لیے ریزرویشن کروا آیا ہوں راجہ مور کی 'فکشن میکر' بہت رش لے رہی ہے۔ کھانا کھانے کے بعد تم فوراً تیار ہو جاؤ۔''

''مائی گاڈ۔ آج تو مجھے اپوا کی میٹنگ میں جانا ہے۔ ویسٹ پاکستان سے مسز سلیمہ احمد آ رہی ہیں۔''

''مسز احمد کو تو گولی مارو اور آج کی شام میرے ساتھ گزارو۔شوہر کو بھی کسی کھاتے میں رکھ لیا کرو۔''

''کمال ہے۔سارا دن آپ اور آپ کے بچوں کے چاؤ چونچلوں میں گزرتا ہے اور ابھی بھی آپ کو وقت اور توجہ نہ ملنے کی شکایت ہے۔میں تو تمہاری اِس میل ڈومینیٹنگ Male Dominating ذہنیت سے عاجز آ گئی ہوں۔''

واش بیسن میں ہاتھ دھو کر وہ کھانے کی میز پر آ بیٹھا۔کھیرے کے قتلے کو منہ میں رکھتے ہوئے اُس نے ڈونگے میں سجی مچھلی کو شوق و رغبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''سالن کی صورت بتاتی ہے کہ اسے یہ رنگ و روپ مالکن نے دیا ہے۔''

بھات پر دو موٹے قتلے رکھتے ہوئے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا جو بہت پھرتی سے میز پر کھانا لگانے میں مصروف تھی۔

''رضی'' وہ ممیائی۔

''پلیز کینسل کر دو نا آج جانا۔''

''ہرگز نہیں۔'' اس کا انداز جیسے دھاڑنے والا تھا۔

بچے کھانے کے لیے ٹیبل پر بیٹھے اور انہوں نے فلم کا سُنا تو تالیاں بجاتے ہوئے ساتھ جانے کے لیے شور مچایا۔ماں نے ڈانٹا اور پیار بھری خفگی سے کہا۔

''کوئی ضرورت نہیں۔اچھے بچے فلمیں نہیں دیکھتے۔ہوم ورک کرنا ہے۔''

پر باپ نے کہا۔ ''خیر ہے کبھی کبھی تفریح ہونی چاہیے۔''

وہ اہتمام سے تیار ہوئی۔سُرخ اور سیاہ پھولوں کی راجشاہی سلک کی ساڑھی اس پر بہت اچھی لگ رہی تھی۔بوجھل سا جوڑا اس کے گداز شانوں پر پڑا تھا۔نفاست سے کیے گئے میک اپ نے چہرے کو دلآویزی دی تھی اور جب وہ اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تو اس

نے جوشیلی اور محبت کی بھرپور نظریں اس پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''طاہرہ بس ذرا موٹا پے نے کام خراب کر دیا ہے ورنہ۔۔۔۔''

اس نے اپنے شوہر کی بات سُنی اور گردن کو ادائے ناز سے اُس کی طرف جنبش دی۔

''مدتوں بعد میری تعریف میں تم نے کچھ کہنا چاہا بھی تو اُسے اُدھورا ہی چھوڑ دیا۔ بات تو پوری کرتے کہ مجھے بھی پتہ چلتا کہ میں کس حسینہء عالم سے مماثلت رکھتی ہوں۔''

اس کے موٹے اور قدرے سیاہی مائل ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ پیدا ہوئی۔گاڑی کو چوتھے گیئر میں ڈالتے ہوئے اُس نے کہا۔

''تمہارا دماغ تو پہلے ہی بہت آوٹ رہتا ہے۔ایسا کچھ خوبصورت سا سُن کر بات کہاں جائے گی؟''

اُس نے اِس بات کا بُرا تو منایا پر چہرے پر ناگواری کا کوئی تاثر پھیلنے نہیں دیا۔ شوہر کی عادت جانتی تھی۔

اور پھر وہ ایک دوسرے کے پیچھے چلتے گیلری میں آئے اور اپنی نشستوں پر بیٹھے۔ بچوں نے بیٹھتے ہی ماں سے تلے ہوئے بادام (مونگ پھلی کے دانے) خریدنے کی ضد کی جنہیں ایک نوعمر لڑکا لکڑی کی ٹرے میں سجائے بیچ رہا تھا۔اس نے تین چھوٹے پیکٹ خریدے۔دو بچوں کو دیئے۔ایک اپنے لیے بیگ میں رکھا۔لڑکے کو پانچ کا نوٹ دیا اس سے بقیہ لیا اور جب وہ اس سارے کام سے فارغ ہو کر شوہر کی طرف متوجہ ہوئی۔اس کی آنکھوں میں طنزیہ مسکراہٹ تیر گئی۔چند لمحوں تک اُس نے کمال تحمل اور صبر سے اس عمل کو دیکھا پھر جیسے ضبط کا یارا نہ رہا اور شوہر کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ جیسے پھٹ سی پڑی۔

''بس بھی کرو اب۔کیا نگلنے کا ارادہ ہے انہیں۔''

واقعہ یہ تھا کہ بائیں طرف آخری سرے پر آٹھ دس شوخ و چنچل لڑکیوں کا ایک ٹولہ خوش گپیوں اور چہلوں میں مُصروف تھا۔چلبلی لڑکیاں ایسی ایسی حرکتیں کر رہی تھیں کہ ہال میں بیٹھے بیشتر لوگ اُنہیں ہی دیکھ رہے تھے۔اُن کی وضع قطع سے اُس نے اندازہ لگایا تھا کہ ڈھاکہ ہولی کراس کونونٹ کی طالبات ہیں۔

طاہرہ سے نظریں چار کیا ہوئیں اُس کے تن میں جیسے آگ سی بھڑک اُٹھی۔

''عجیب عورت ہے یہ۔آدھا ہال اُن کی طرف متوجہ ہے اور اِسے فقط میں ہی اُنہیں گھورتا ہوا نظر آ رہا ہوں۔

اُس کا دماغی میٹر گھوم گیا تھا۔اپنے صحت مند جسم کو زوردار جھٹکا دیتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور اُسے ڈانٹ ڈپٹ کرتا باہر نکل گیا۔اس کا بھی جی چاہا کہ وہ اُسی وقت اُٹھے۔دونوں بچوں کے ہاتھ پکڑے اور گھر چلی جائے۔

پر وہ چاہتے ہوئے بھی ایسا نہ کر سکی۔وہ ایک ماں تھی جس کے پیش نظر اپنے بچوں کی خوشی تھی۔دماغ میں غم و غصے کا لاوہ پکتا تھا۔ہاتھ اضطراری حالت میں اِدھر اُدھر حرکت کرتے تھے۔آنکھیں سکرین پر جمی ہونے کے باوجود کچھ نہیں دیکھتی تھیں بس وہ کرسی میں پھنسی بیٹھی صورت حال پر پیچ و تاب کھاتی تھی۔

ریس کورس روڈ پر جگمگاتے ڈھاکہ کلب کے کمپاؤنڈ میں جب اُس نے ایک جھٹکے سے گاڑی روکی اور کھٹاک سے دروازہ کھولا تو نیلگوں روشنی میں ڈوبے لاؤنج میں درمیانی میزوں میں سے ایک پر بیٹھا بادل جو کوک ٹیل کے گلاس میں برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو شیشے کی سلاخ سے ہلاتے ہوئے اس موٹے تازے دیوہیکل اٹیلین کی گفتگو کو بڑی محویت سے سن رہا تھا چونک پڑا۔

وہ تیز تیز چلتا ہوا آیا۔خالی کُرسی پر دھم سے گرتے ہوئے اُس نے بغیر کچھ کہے

کوک ٹیل کا گلاس بادل کے آگے سے اُٹھایا۔لبوں سے لگایا۔چند گھونٹ بھرے اور پھر اُسے میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

''ایک ذہین اور تیز طرار بیوی بھی کسی خدائی عذاب سے کم نہیں۔''

بادل مسکرایا ضرور پر اُس نے کچھ پُوچھا نہیں۔وہ سمجھ گیا تھا کہ دونوں میں آج پھر کھٹ پٹ ہوئی ہے۔

دیوہیکل اٹیلین اطالویوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ انہیں ذمہ دار اور فرض شناس ثابت کرنے کی کوشش میں اُس کا سُرخ چہرہ چقندر جیسا ہو رہا تھا۔

وہ کچھ دیر تک غایت سکون سے یہ لن ترانیاں سُنتا رہا۔کوک ٹیل پیتا رہا اور جب معاملہ قوت برداشت سے بڑھ گیا۔تب زہر بھرے لہجے میں بولا۔

''ذرا سنو اِس کی بکواس۔اوّل نمبر کی چور اچکّی قوم۔''

ٹیرس پر رقص شروع ہو گیا تھا۔ساز تیز تیز بجنے لگے۔قریبی میز پر بیٹھی ڈورتھی اور سروج شرما اُٹھ کر جانے لگیں۔عبداللہ اور رونو بھی اُٹھ گئے تھے بادل بھی کھڑا ہو گیا اور اس سے بولا۔

''چلو نا ایک راؤنڈ ہو جائے۔''

اُس نے معذرت کی۔ ''یار دل نہیں کرتا۔''

اور جب بادل چلا گیا۔اطالوی بھی اُٹھ گیا۔میز خالی ہو گئی۔تب خود کو کُرسی میں اور زیادہ ڈھیلا کرتے ہوئے اس نے غربی سمت ٹینس کھیلنے والوں کی ٹولی کو ایک نظر دیکھا اور پھر آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا۔

''بھلا طاہرہ اس وقت کہاں ہو گی۔سینما میں یا گھر پر۔''

باب نمبر۲:

اپنے گھر کے بیرونی تھڑے پر بیٹھااور وہاں محفلیں سجاتا اب وہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ ایک تو اُس نے تاڑ جتنا قد نکال لیا تھا۔ دوسرے اب وہ کوئی ارمنی ٹولہ ہائی اسکول کے چوتھے پانچویں درجے میں تھوڑی پڑھتا تھا بلکہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں آنرز کا سٹوڈنٹ تھا۔ سیاست اور فلسفہ اُس کے دل پسند مضامین تھے۔

اِس لمبے چوڑے تھڑے سے آگے اُس کا بڑے بڑے محرابوں بیل پایوں اور شہہ نشینوں والا محل نما گھر تھا جس میں سبز کھڑکیوں والا ایک کمرہ اُس کا بھی تھا۔ یہ عجیب بات تھی اُسے اپنے کمرے سے ذرا بھی رغبت نہ تھی۔ سارے گھر کی طرح وہ بھی اُسے اجنبی ہی لگتا جو شانتی اور سکون ملتا تو اِسی سُرخ سُرخ نتھری اینٹوں والے تھڑے پر جہاں اُس کی دنیا آباد ہوتی۔

وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر پاکستان کے مستقبل پر بحث کرتا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے اساتذہ کے بخیئے اُدھیڑتا۔ ساتھ پڑھنے والی لڑکیوں پر تبصرے کرتا۔ نکڑ پر پھول محمد کے چھوٹے سے کھوکھے سے چائے منگواتا۔ خود بھی پیتا اوروں کو بھی پلواتا۔ رات ڈھلنے پر اُٹھتا اور اپنے کمرے میں آتا یوں جیسے کوئی اجنبی شب بسری کے لیے کسی سرائے میں جاتا ہے اس کا بس چلتا تو اپنا بستر بھی وہیں اُٹھا کر لے جاتا۔ اپنے بھائیوں سے وہ قدرے دبتا تھا بڑے دونے تو اُسے اُس کے حال پر چھوڑ رکھا تھا۔ پر چھوٹے دو اکثر و بیشتر اسے تھڑے پر یوں محفل سجانے پر ٹوکتے رہتے۔

یوں یہ اور بات تھی کہ وہ اُن کی کم سُنتا تھا اور وہی کرتا تھا جو اُس کا دل چاہتا۔

اُس کے اِس رویے کے پسِ منظر میں اُس گھر کے مکینوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

اُس کی نصف درجن بھاوجیں جو نیلے، پیلے، سبز اور سُرخ باڈروں والی ساڑھیوں سے بندھے چابیوں کے گچھے کمروں پر چھنکاتی بڑی سی انگنائی میں پُھنکارے مارتی شانوں پر بھاری بھرکم جوڑوں کا بوجھ ڈھلکائے، کلوں میں پان کی گلوریاں دبائے، کھٹا کھٹ بنگلہ اور کبھی کبھی اُردو بولتیں کسی طور بھی ٹھسے کی لکھنوی بیگمات سے کم نظر نہ آتیں اور جب وہ لڑنے پر آتیں تو ایک دوسرے کی سات پُشتیں تک گن ڈالتیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر سازشی حاسد چغل خور اور مکاّر بستے رَستے گھروں میں آناً فاناً آگ لگا کر تماشا دیکھنے اور اچھے بھلے ذہنوں میں شکوک وشبہات کے بیج بو کر اُنہیں پروان چڑھانے والیاں۔ اُن کے چھوٹے چھوٹے کچر پکر سُرسُر کرتے ناکوں والے بچے۔

اُسے نفرت تھی اُن سب سے۔ وہ بیزار تھا اُن کے بچوں سے۔ وہ بھاگ جانا چاہتا تھا اُس گھر سے۔ پر مجبوریاں تھیں جو پاؤں باندھے ہوئے تھیں۔ بھلا اپنے پاؤں پر کھڑا ہوئے بغیر وہ کہاں جا سکتا تھا۔

ماں کا تو اُسے ایک ہیولا سا یاد تھا۔ جہاں آرا آپا کا دم بس غنیمت تھا۔ اُن کے بچوں کے ساتھ گھِستا گھِستا تا وہ پل گیا۔

اور جو کوئی یاد تھا تو سفید براق داڑھی والا وہ انسان جو ڈھاکہ کی علمی ادبی اور سیاسی شخصیت تھی۔ جو میر حبیب الرحمٰن کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا جس کی آنکھوں میں ہمہ وقت اپنے اور غیروں کے لئے محبت کے سوتے اُبلتے جس کی آواز میں دبدبہ، گونج اور کڑک ہونے کے ساتھ ساتھ محبت کی مٹھاس بھی گھلی ہوئی ہوتی۔ وہ اسی علم دوست اور باغ و بہار شخصیت کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔

اِس لمبی چوڑی ڈیوڑھی کے بائیں ہاتھ اُس کا کمرہ تھا۔ یہ کمرہ جو اب مقفل تھا۔ پہلے ہمیشہ کھُلا رہتا۔ صاف ستھرا چاندنی کا فرش جس پر گاؤ تکیے رکھے ہوتے۔ پیچوان کی

گڑگڑاہٹ اُونچی اور جوشیلی آوازوں کے ساتھ مل کر عجیب سا سماں پیدا کرتی۔ دروازے میں کھڑا ملازم چھوکرہ حکم بجا لانے کے لئے مستعد ہوتا۔ اِسی سرخ اینٹوں والے تھڑے کی سیڑھیاں چڑھ چڑھ کر ڈھاکہ کی نامور شخصیات اِس کمرے میں آتیں۔ چائے کا دور چلتا۔ اتوار کی صبح نہاری ہوتی۔ سیاسی بحثیں طُول پکڑ جاتیں تو رات کا ایک بج جاتا۔ محفل شعر و سخن جمتی تو واہ واہ، سبحان اللہ کے نعروں سے پُورا گھر گونج اُٹھتا۔ اِن آنے والوں میں نُورالامین اور خواجہ ناظم الدین اُسے بہت اچھی طرح یاد تھے اور یاد کیسے نہ ہوتے کہ وہ دونوں کی گود میں باری باری ضرور بیٹھتا۔

وہ اگلے جہان کیا گیا کہ خُوشیوں کے ہنڈولے میں جُھولتا گھر دھڑام سے زمین بوس ہوگیا۔ اِس گھر کے اتفاق و محبت کو جیسے کسی کی نظر کھا گئی۔ اس کے مرنے کے بعد کیا کچھ نہ ہوا۔ ابھی تو اُس کا کفن بھی میلا نہ ہوا تھا کہ جائیداد کے بٹوارے پر جھگڑے فساد شروع ہو گئے۔ اُس کی چار عدد بہنیں اپنے شوہروں سمیت اپنے اپنے حصے بخروں کے لئے اس گھر میں آدھمکیں۔ ایسے ایسے دل دہلا دینے والے منظر اُس کی آنکھوں نے دیکھے کہ کبھی وہ گھر کے کسی کونے میں منہ دے کر زار زار رو دیتا اور کبھی اُس کا جی چاہتا کہ وہ اِن سبھوں کو جو خونی رشتے کے ناطے اُس کے بہن بھائی ہیں۔ مٹی کا تیل چھڑک کر بھسم کر ڈالے۔ وہ ابھی اتنا بڑا نہیں تھا۔ اتنا سمجھدار بھی نہ تھا لیکن خود غرضی، فریب اور ریاکاری کے ایسے ایسے نمونے اُس کے سامنے آتے کہ وہ بسا اوقات کُڑھ کر اپنے آپ سے کہتا۔

''اِنہیں کیا ہوگیا ہے؟ اِن کی آنکھوں پر حرص و ہوس نے کیسی پٹیاں باندھ دی ہیں کہ نہ تو اُنہیں اپنے اتنے بڑے باپ کا احساس ہے اور نہ ہی یہ خیال کہ اُنہوں نے اپنے مرحوم باپ کی عظمت اور خاندان کا وقار سب اپنی اغراض کے لئے داؤ پر لگا دیا ہے۔ مجھے تو یوں جان پڑتا ہے جیسے اُن کا خون سفید ہوگیا ہے۔ اچھے بُرے کی تمیز ختم ہوگئی ہے۔ میرے

اللہ تو مہربان ہے اُنہیں ہدایت دے۔''

آج صبح ہی صبح اُس کی طبیعت سخت مکدّر ہوگئی۔ابھی سُورج اچھی طرح نہیں نکلا تھا کہ اُس کی منجھلی بھاوج اور تیسرے نمبر کی بہن میں خوفناک قسم کی جنگ چھڑ گئی۔ جلتا بھُنتا وہ اپنے بستر سے اُٹھا اور باہر آ گیا۔تھڑے پر بیٹھ کر اُس نے گلی میں نظر دوڑائی۔ابھی اُس کی چہل پہل اور رونق بحال نہیں ہوئی تھی۔اِکاّ دُکاّ لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ اندر سے آوازوں کا شور گھٹنے کی بجائے بڑھ رہا تھا اور وہ پریشان خود سے باتیں کئے جاتا تھا۔

امریکہ نے کتنا ظلم کیا تھا۔ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم برسائے۔بھولے بھالے معصوم جاپانیوں کو تباہ و برباد کیا۔میری مانتا تو ایک بم یہاں گراتا۔اِس گھر کو کتنی اشد ضرورت ہے کسی ایسی ہولناک تباہی کی جو اِس کے مکینوں کو موت کی میٹھی نیند سُلا دے۔ کیونکہ جیون کی سکون بھری نیندیں اُنہوں نے اپنے اُوپر حرام کر لی ہیں۔کاش میرے بس میں ہوتو اُن کے چیختے چلاّتے اور چنگھاڑتے گلوں میں لکڑیاں ٹھونس دوں کہ اُن کے گلے پھٹ جائیں اور اُن سے کوئی آواز نہ نکلے۔

لڑنے جھگڑنے والی کوئی بات تو نہ تھی۔

کل نورالزماں دیوان کے ہاں گھر کی سب عورتیں ولیمے کی دعوت میں شرکت کے لئے گئی تھیں۔ مگ بازار سے بابا کے چچیرے بھائی کا کنبہ بھی آیا ہوا تھا۔دیوان جی کی بڑی بہو اول نمبر کی کٹنی اور چالباز عورت کتنی دیر جانے منجھلی بھابھی کے کان میں کیا کیا کانا پھوسیاں مارتی رہی۔کس کس کے خلاف لگائی بجھائی کی کہ منجھلی بھابھی تو وہیں پھوں پھوں کرنے لگیں۔

تائی اماں نے کہا۔

''اے دلہن کاہے کو اتنا چلا چلی کرتی ہو۔آپے میں رہو۔

منجھلی بھاوج ایسی بیوقوف۔سمجھی سارا کیا دھرا نند کا ہے جس نے تائی اماں جیسی صُلح جُو قسم کی عورت کو اتنے سخت لفظ کہنے پر مجبور کر دیا۔منہ بند اور ریپٹ پھلائے جانے اُس نے رات کیسے گزاری؟''

صبح شامت اعمال سے نند کا چھوٹا بیٹا لڑھکتا لڑھکتا اُس کے حصے میں آ گیا اور پاخانہ کر دیا۔اُونگھتے کو ٹھیلے کا بہانہ جو شروع ہوئیں تو بھادوں کی بارش کی طرح رُکنے کا نام نہ لیں۔

بڑے بھیا گھاٹ تک سیر کے لئے گئے ہوئے تھے۔وہ واپس آئے تو گھر میں حشر کا ساسماں تھا۔بہتیرا ٹیپ اپ کروایا۔پر منجھلی بھابھی تو اُس دن طعنوں کی توپ و تفنگ سے نند کو اس طرح گھائل کر دینا چاہتی تھی کہ وہ دنوں اِس تواضع کو یاد رکھے۔

اُس نے گلی میں چاروں طرف پھر نظریں دوڑائیں۔پھول محمد کی دکان پر کافی بھیڑ تھی۔چھوٹے چھوٹے بچے گلاس ہاتھوں میں پکڑے گائے کا پاؤ پاؤ بھر دودھ لینے کے لئے کھڑے تھے اور ایک دوسرے سے پہلے لینے کے لئے حلق کی پوری آواز سے اُسے متوجہ کرنے میں مصروف تھے۔

عبدالرب اپنی سائیکل پر گزرا اور تازہ اخبار اُس کی طرف پھینکتا ہوا بولا۔

''خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر دیا گیا۔''

اُس نے چونک کر اُسے دیکھا اور اخبار پکڑ کر اپنے گھٹنے پر پھیلاتے ہوئے تیزی سے اُس پر نظریں دوڑائیں۔

پہلی شہ سُرخی اُس کی برطرفی کی تھی۔

''یہ بہت غلط ہوا ہے۔''

اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

اور جب اُس نے خبر کی تفصیل اور اداریہ پڑھ لیا تب وہ دُکھ بھرے لہجے میں اپنے آپ سے بولا۔

''امن ،سکون اور شانتی کیسے دُنیا سے اُٹھتی جارہی ہے؟ گھر ہوں یا مُلک ہر جگہ مال وزر کے حصول کی اندھی ہوس اقتدار اور کُرسیوں کی تڑپ نے حق سچ کو تہہ تیغ کر دیا ہے۔''

اور اخبار اُٹھا کر جب وہ اندر گیا تو اُس کی بڑی سے چھوٹی بہن دُلدو آپا کے بچے بھی اُس خبر پر تبصرہ کر رہے تھے۔

باب نمبر۳:

اب ایسی بھی کوئی بات نہ تھی کہ وہ اپنی اِس گھبراہٹ اور بے چینی کو جوں بیٹھے بٹھائے تپ ملیریا کی طرح یکدم اُس پر چڑھ دوڑی تھی کے پس منظر سے ناواقف تھا۔ ٹھنڈے پانی سے لبالب بھرے دو گلاس اُس کے اندر یوں گئے جیسے مئی جون میں تپتی زمین پر ایک قطرہ پانی پڑے اور بھک سے اُڑ جائے۔ اُبھرتے، ڈوبتے اور مضطرب دل کو ذرا بھی سکون اور چین نہ ملا۔

میز پر فائلوں کا انبار پڑا تھا۔ اُس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی فائل کو ہاتھ لگائے اور کھولے۔ اُس کا اسسٹنٹ نورالزماں آیا۔ صوبائی سطح پر چند دنوں بعد جنرل مینجروں کی جو اہم میٹنگ چٹا گانگ میں ہونے والی تھی۔ وہ اُس کا ایجنڈا اپرول Approval کے لئے لایا تھا۔ اُس نے بے دلی سے کاغذ اُس کے ہاتھ سے پکڑا۔ میز پر پیپر ویٹ کے نیچے رکھا اور سر کے اشارے سے اُسے چلے جانے کو کہا۔ چپڑاسی ریجنل ڈائریکٹر کے پاس سے فائل لایا اُس نے وہ بھی پکڑی اور بغیر کھولے میز پر ڈال دی۔

اُس کا ذہن گڈمڈ سا ہو رہا تھا۔ کسی بھی کام پر توجہ دینے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اُٹھا۔ اپنے چھوٹے سے کمرے میں اِدھر اُدھر چکر کاٹنے لگا۔ پھر شیشے کی دیوار سے باہر دیکھنے لگا۔

سڑک پر آگے پیچھے نئی نویلی اور پرانی کاروں، منی بسوں اور سائیکل رکشاؤں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ موتی جھیل کا کمرشل ایریا، زیر تعمیر عمارتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ، سامنے جناح ایونیو کی شاندار دوکانیں اور اُن کے دروازوں میں داخل ہوتے اور باہر نکلتے صاحب ثروت لوگ۔

اِس منظر میں اُس کے لئے کوئی نیا پن یا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ جب سے وہ یہاں ملازم ہوا تھا اور یہ کمرہ اُس کی تحویل میں آیا تھا۔ وہ سینکڑوں بار یہ سب دیکھ چکا تھا۔ پر جانے آج کیا بات تھی؟ اُس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''ڈھاکہ کس تیزی سے اپنی جون بدل رہا ہے۔ سر بفلک عمارتیں اپنے دامنوں میں آباد جھونپڑوں کا مذاق اُڑاتی ہیں۔ دھوتیاں صنعتی ترقی نے کونے کھدروں میں چُھپا دی ہیں۔ تیزی سے بدلتی اقدار نے معاشرتی زندگی کا ڈھانچہ بدلنے پر کمر کسی ہوئی ہے۔ خلوص، پیار اور محبت پر بھی کائی سی جم گئی ہے۔ ہر ایک ننانوے کے چکر میں اُلجھا ہوا نظر آتا ہے۔

وہ میز پر دوبارہ آ کر بیٹھ گیا۔ کلائی پر نظر ڈالی۔ ابھی ایک بجنے میں آدھ گھنٹہ باقی تھا۔

اُس نے اُکتاہٹ کے انداز میں اپنے دونوں بازو اُوپر اُٹھائے۔ فون کو دیکھا، بغیر کسی ارادے کے ریسیور کریڈل سے اُٹھایا۔ ہاتھوں میں ہلکے ہلکے گھماتے ہوئے اُس نے خود سے کہا تھا۔

یہ فون ہی تو ہے جس نے اُسے اضطراب میں ڈال دیا ہے۔

بات تو بس اتنی سی تھی کہ وہ تو کام میں پورے انہماک سے مگن تھا۔ بس ابھی تھوڑی دیر پہلے اُس کے بڑے بھائی احتشام الرحمٰن کی بیوی نجمہ احتشام نے اُسے فون پر دوپہر کا کھانا اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی تھی۔ اُس نے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ آج نہیں آ سکے گا۔ دفتر میں کام بہت ہے۔ لیکن نجمہ احتشام نے اُسے صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ اُس کی دونوں چھوٹی بہنیں رات کلکتہ سے آئی ہیں۔

اُس کا ہاتھ یہ بات سُنتے ہی اِک ذرا لرزا تھا۔ دل بھی دھڑکا کیونکہ دونوں بہنوں

کی کلکتہ سے آمد اور اُس کا کھانے پر مدعو کیا جانا ایک ہی سلسلے کی کڑی تھا۔اُن دونوں میں سے ایک کو اُسے اپنی بیوی کے طور پر پسند کرنا تھا۔اُس نے پہنچنے کا وعدہ کیا اور فون بند کر دیا۔

تب سے یہی چھوٹا سا واقعہ اُس کی بے چینی اور اُلجھن کا باعث بنا ہوا تھا۔طبعاً وہ کچھ اتنا شرمیلا لڑکا بھی نہ تھا پر شاید یہ دیکھنے دکھانے والا سلسلہ نفسیاتی طور پر عجیب سے تاثرات قلب و ذہن پر منعکس کر رہا تھا۔اور جب ایک بج گیا وہ کرسی سے کھڑا ہو گیا۔اُس نے تنقیدی نظر اپنے کپڑوں پر ڈالی۔

''ٹھیک ہی ہیں۔'' اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

پر جب وہ لفٹ سے نیچے جانے کے لئے اُس میں داخل ہوا اور شیشے میں اپنے سراپے کا ناقدانہ جائزہ لیا۔اُس کے جی میں آئی کہ اگر وہ گھر جا کر کپڑے تبدیل کر لے تو زیادہ مناسب ہوگا پر اگلے لمحے اُس نے اِس خیال کو جھٹک دیا۔سج سجا کر جانے کے تصور سے ہی اُسے عجیب سی وحشت کا احساس ہوا۔

''لعنت بھیجو۔یہ کچھ کچھ شکنوں والے کپڑے، ذرا ذرا بکھرے بال، چہرے پر بکھرا قدرے مصروفیت کا پرتو شخصیت کی گھمبیرتا کا عکاس ہے۔کالجوں میں پڑھنے والی وہ لڑکیاں میرے اِس رویئے سے جان جائیں گی کہ میں نے اُن کا قطعی نوٹس نہیں لیا۔''

گراؤنڈ پر پہنچ کر وہ اپنے نئے نویلے ہنڈے کی طرف بڑھا۔ گگ بازار کی طرف جاتے ہوئے کتنے ہی خیال اُس کے دماغ میں آئے اور ہینڈلوں پر اُس کی مضبوط گرفت پر اثر انداز ہوئے۔

گھر کے برآمدے میں ہی اُسے نجمہ نظر آ گئی جس نے اُس کا استقبال معنی خیز مسکراہٹ سے کیا اور اُسے لئے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

اور پھر یوں ہوا کہ نجمہ احتشام کے بے حد خوبصورت ڈرائنگ روم میں دُلدو آپا

سے باتیں کرتے ہوئے اُس نے آناً فاناً ہی وہ فیصلہ کرڈالا جس کا خیال ہی اُسے بولائے جا رہا تھا۔

وہ سروقد نازک سی لڑکی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے کمرے میں آ کر داہنے ہاتھ کے صوفے پر بیٹھی تھی اُسے بے طرح بھا گئی۔ وہ یقیناً کسی طرح بھی اپنی اُس بہن سے اچھی نہ تھی۔ جس کی چمپئی رنگت، گردن تک کٹے بالوں کے درمیان پوری آب و تاب سے چمک رہی تھی۔ جو شانتی نکیتن کی سٹوڈنٹ تھی اور کتھک سے لے کر رمبا تک سبھی طرح کے رقص کرنا جانتی تھی۔ جو سُنا تھا بُہت اچھا گاتی ہے اور اس وقت بھی بڑی میٹھی آواز میں باتیں کر رہی تھی۔

پر پتہ نہیں اُسے یہ سب کیوں اپیل نہ کیا۔ اُس نے دیکھا سانولے سے ایک وجود نے برآمدے میں سے گزرتے ہوئے بڑی ادا سے نفیس کڑھت کی سوتی ساڑھی کے لمبے آنچل کو پام کے پودوں سے اُلجھنے سے بچایا اور جب اُس نے ایسا کیا تھا وہ بُہت دلکش نظر آئی تھی۔ وہ جو لیڈی برے بورن کالج کلکتہ میں تھرڈ ائیر میں پڑھتی ضرور تھی پر جسے رقص و موسیقی سے ذرا بھی لگاؤ نہ تھا۔ لیکن اِس کے باوجود اُس لڑکے نے فیصلہ کیا کہ یہی اور صرف یہی لڑکی اُس کی زندگی کی ساتھی بنے گی۔

باب نمبر۴:

اور جب خلیج بنگال کی مون سون کلکتے پر چھاجوں پر پانی برسا رہی تھیں۔دھرم تلے میں واقع پیل پایوں اور خوبصورت جھلیموں والے اُس وسیع وعریض گھر کے آراستہ پیراستہ کمرے میں اُسے انگوٹھی پہناتے ہوئے اُسے ایک بار بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ سانولی سی رنگ والی یہ سرو قد لڑکی جس کے حُسن سادہ نے پہلی ہی نظر میں اُس کے دل کے خوابیدہ تاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور جواب طاہرہ پنچی کی بجائے طاہرہ رحمٰن بن رہی ہے۔آنے والے سالوں میں ایک انتہائی تیز طرّار اور رُعب دوب والی بیوی ثابت ہوگی۔

آسمان کے سینے میں چھید ہو گئے تھے جن میں سے پانی ایک تواتر کے ساتھ بہہ رہا تھا۔آنگن میں اُگے کیلے کے درخت ہوا کے زور سے جُھکے پڑتے تھے اور اسوک کے پھولوں کا رنگ نکھرتا جا رہا تھا۔

پر اتنی تیز بارش کا اثر اُس گھر میں ہونے والی تقریب پر بس معمولی سا تھا۔مشرقی اور مغربی بنگال دونوں ہی اس کے عادی ہو گئے تھے۔اِن بارشوں سے اُنہیں کہیں فرار تھا۔

منگنی کی رسم بڑے ہال میں ہو رہی تھی۔دودھیا ٹیوبوں کی روشنی کے ساتھ ساتھ سینکڑوں موم بتیوں کی زرد زرد روشنی کمرے میں پُر اسرار سا اُجالا بکھیر رہی تھی۔موم بتیاں خوبصورتی کے ساتھ ساتھ دفاعی انتظامات کے تحت روشن کی گئی تھیں کہ اگر برقی روشنیاں گُل ہو جائیں تو اندھیرا بدشگونی کا موجب نہیں بننا چاہیے۔جیون کا یہ بندھن رنگ و بُو کے ساتھ شروع ہوا اور ایسے ہی ختم ہو۔

طاہرہ کی ماں اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی توہم پرست واقع ہوئی تھی۔بڑی بہو اور بیٹی کو کوئی بیس بار تاکید کی ہوگی۔دس بار خود اُٹھ کر جائزہ لیا تھا۔

شانتی نکیتن اور لیڈی بر ے بورن کالج کی شوخ وشنگ لڑکیوں نے اُدھم مچا کر کمرہ سر پر اُٹھا رکھا تھا۔

وہ جب طاہرہ پنّی کے منجھلے اور بڑے بھائی کے ساتھ رسم کی ادائیگی کے لئے ہال میں آیا تو اُس کا سواگت جس طرح ہوا وہ اُسے بوکھلانے کے لئے کافی تھا۔لڑکیوں سے تو اُس کا خاندان بھی اَٹا پڑا تھا۔یوں بھی وہ چھ سال تک لڑکیوں کے ساتھ پڑھتا رہا تھا۔ گھبرانے والی بات تو نہ تھی پر ایک تو کلکتہ کی کان کاٹتی لڑکیاں دوسرے موقع محل کی مناسبت۔

خوشگوار موسم کے باوجود اُس کی پیشانی قطروں سے بھر گئی اور چہرہ سُرخ ہوگیا۔ بے بسی سے اُس نے دور کونے میں بیٹھی اپنی بہن دُلدو آپا کو دیکھا جو چیت پور روڈ سے آئے ہوئے اپنے سُسرالی عزیزوں کے ساتھ مل کر بنگلہ لوک گیت گا رہی تھیں۔اُنہوں نے اُس کی پریشانی کا خیال کیا اور فوراً ہی اُٹھ کر اُس کے پاس چلی آئیں اُس کے شانوں پر محبت سے اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے اُنہوں نے کہا۔

''اے گھبرا کیوں گئے ہو؟ اپنے ہی تو لوگ ہیں۔''

خوبصورت لڑکیوں کے جلو میں گلابی ساڑھی میں لپٹی طاہرہ پنّی کو عین اُس کے سامنے صوفے پر لا کر بٹھایا گیا۔

دُلدو آپا نے انگوٹھی اُس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔

''لو پہناؤ اِسے۔''

اور وہ تذبذب میں ڈوبا یہ سوچ رہا تھا کہ وہ اب کیا کرے۔حواس تو قابو میں ہی نہ تھے۔دائیں بائیں کے فرق کا کیا پتہ چلتا۔اُس کی بہن نے اِس مشکل کو سمجھا اور اُنہوں نے جب اُس کا ہاتھ پکڑ کر دُلہن کی طرف بڑھانا چاہا تو لڑکیوں نے بہت غُل غپاڑہ مچایا۔

''کیا کرتی ہیں دُلدو آپا۔واہ اتنے تو دُودھ پیتے بچے ہیں۔''

دو تین لڑکیوں کا قلقاریاں مارتی ہنسی کا غُبارہ جیسے فضا میں پھٹا۔

''لومیاں شادی کرنے آئے ہیں۔''

اور دُلدو آپا جھلا کر بولیں۔

''نیک بختو دم لو۔کچھ پھر کے لئے بھی رکھ لو۔''

پر لڑکیاں تو جیسے اُدھار کھائے بیٹھی تھیں۔یوں تابڑ توڑ حملے کئے کہ وہ مزید بوکھلا گیا۔اب طاہرہ پنّی کی ماں نے مداخلت ضروری سمجھی۔

''بس کرو اب۔بہتیرا ستالیا ہے باقی کا شادی پر اُدھار۔''

دائیں بائیں معمر خواتین آ کر کھڑی ہوگئیں اور اُن کی مدد سے اُس نے اِس پُل صراط کو جس پر سے وہ پھسلا جاتا تھا جیسے تیسے کر کے پار کر ہی لیا۔

پھر جب مونسونوں کا سارا زور شور ختم ہو گیا اور وہ برس برس کر ہانپ گئیں۔تب وہ اپنے چیدہ چیدہ عزیزوں کے ہمراہ اُسے کلکتہ سے بیاہ کر ڈھاکہ لے آیا۔اُس قدیم تاریخی گھر میں اُتارنے کی بجائے وہ اپنی دُلہن کو بیت المنیر ہ لے گیا جہاں تین کمروں کا ایک خوبصورت سا گھر اُس نے کرائے پر لے لیا تھا۔

جہاں آرا اور دُلدو آپا چاہتی تھیں کہ دُلہن اُس گھر میں اپنا پہلا قدم رکھے جو اُن کے باپ کی میراث تھا۔اُنہوں نے اِس پر زور بھی دیا۔دوسری بہنوں اور بھائیوں نے بھی اپنی سی کوشش کی کہ وہ چند دنوں کے لئے دُلہن کو اُس گھر میں رکھنا چاہتے ہیں۔اُن کے اصرار کو اُس نے خوبصورتی سے ٹال دیا۔پر جہاں آرا آپا کے سامنے اُس نے اپنے پھپھولے ضرور پھوڑ دیئے تھے۔

''آپ مجھے مجبور مت کریں۔میں ایسی رسوم اور شگن ویہاروں کا ہرگز قائل

نہیں ۔اب اتنی ممتا پھٹ پڑی ہے اُنہیں میری ۔جب وقت تھا تو کوئی مُنہ لگانا پسند نہیں کرتا تھا۔

اُس نے قسم کھا رکھی تھی کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر کبھی اِس گھر میں نہیں رہے گا۔وہ گھر جہاں وہ سدا اجنبی ہی رہا۔اب تو نہ صرف وہ صاحب روزگار تھا بلکہ ایک عدد بیوی کا شوہر بھی بن گیا تھا۔اب ایسے میں وہ اپنی قسم توڑتا اور اُس ماحول میں چند سانس لینے کے لئے دوبارہ آتا جس کی تعفّن اور دُھواں دُھواں فضا میں اُس کا دم گھُٹتا تھا۔

بہنوں، بھاوجوں اور بہنوئیوں نے چبا چبا کر باتیں تو کیں ۔لیکن بھاوجوں نے شکر بھی ادا کیا کہ مصیبت ٹلی ۔مُفت میں جو یہاں ڈٹ کر بیٹھ جاتے تو کیا ہوتا ؟ گھر تو پہلے ہی تنگ ہو رہا ہے ۔پر چوتھے اور پانچویں نمبر والی بڑی تلملائیں ۔دونوں نے اکٹھے بیٹھ کر دیور اور دیورانی کے چیتھڑے کر ڈالے ۔سات پُشتیں گن ڈالیں ۔

آنے والی کا اُونچا مقدر اُن کی نس نس میں زہر گھول رہا تھا۔اپنا ہر دُکھ اُنہیں یاد آیا تھا اور وہ خون کے آنسو روئی تھیں ۔اپنے اپنے شوہروں کا دیور سے موازنہ کرتے ہوئے دونوں نے شوہروں کے ساتھ ساتھ اپنے نصیبے کو بھی جی بھر کر کوسا۔

طاہرہ رحمٰن ایک ذمہ دار بیوی ثابت ہوئی۔اپنے نئے نویلے ہنڈے پر نئی نویلی دُلہن کے ساتھ اُس نے اولڈ اور نیو ڈھاکہ کی ہر گلی اور سڑک کو روندا جہاں اُس کے عزیز اور رشتہ دار رہتے تھے ۔اُس کا خاندان ڈھاکہ کی قدیم تہذیب کا علمبردار تھا۔گھر کی خواتین بُرقعے کے بغیر باہر نہ نکلتی تھیں ۔پر وہ ان دقیانوسی جھمیلوں میں بالکل نہ پڑا۔

باب نمبر۵:

''میں کیا چاہتا ہوں۔''

اُس وقت جب منگولیا کے پھولوں کی خُوشبو فضا میں تیرتی پھر رہی تھی۔ کیلے کے درختوں کی شاخیں ہواؤں کے بوجھ سے یوں جُھکی پڑتی تھیں جیسے ابھی ٹوٹ کر زمین پر گر جائیں گی۔ دکنی ہواؤں نے پپیتے کی شاخوں کو بھی رقص کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وکٹورین طرز کے دریچے میں نیلے دھاگوں سے لپٹی روکتھوریدی اور منی پلانٹ کی بیلوں کے ننھے منے پتے بھی پھڑ پھڑا رہے تھے۔

سورج کی روپہلی کرنیں دریچے کے راستے خوابگاہ میں داخل ہو کر عجیب سی اُداسی کا احساس بکھیر رہی تھیں۔

اُس نے تکیے کو دوہرا کیا۔ اِس سارے ماحول پر گہری نظر ڈالی اور پیٹ کے بل دوہرا ہوتے ہوئے آنکھیں موند کر اپنے آپ سے یہ سوال کیا۔

''ایک کمزور، مریل اور بدتمیز قسم کی بیوی۔''

''ہاں۔''

وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔

اُس نے بالوں میں ہاتھ پھیرا، کروٹ بدلی اور دوبارہ اپنے آپ سے بولا۔

''شاید نہیں۔''

اُس نے ''ہاں اور نہیں۔'' دونوں جواب اپنے آپ کو خود ہی دیئے۔ سوال بھی اپنے آپ سے ہی کئے تھے۔

اُس کے چہرے پر اندرونی اضطراب کا ہلکا سا غبار چھپایا ہوا تھا۔ چہرہ اُس تازگی

سے خالی تھا جو رات کو پُرسکون نیند لینے پر صُبح دم پیدا ہوتی ہے۔

کلب میں رات گالا نائٹ منائی گئی۔خلاف معمول اُس نے ڈرنک بھی بُہت کی اور رقص بھی کرتا رہا۔

اُس وقت منہ کا ذائقہ کسیلا ہو رہا تھا۔پنڈلیوں میں اینٹھن سی تھی۔دل اُٹھنے پر مائل نہ تھا۔چڑھتی دُھوپ بتا رہی تھی کہ وقت نو کے قریب ہے۔

برآمدے میں برتنوں کی کھٹ کھٹ شروع ہو گئی تھی۔برتنوں کی کھنکھناہٹ سے اُسے ازلی بیر تھا۔یہ شور سُنتے ہی اُسے یوں لگا جیسے اُس کے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔

لیٹے لیٹے اُس نے گونج دار آواز میں نوکر کو ڈانٹ دی۔یہ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ طاہرہ کے سوا نوکروں میں اتنی جُرات نہیں کہ وہ صاحب کی موجودگی میں برتنوں کے ساتھ دھینگا مُشتی شروع کر دیں۔

جب بھی رات کو اُسے گھر آنے کے لئے دیر ہوتی۔اگلی صُبح برتنوں کو ضرور بجایا جاتا۔یہ ناراضگی کا واضح سگنل تھا جسے اُن دونوں کے علاوہ بچے اور نوکر بھی سمجھتے تھے۔

سائڈ ٹیبل سے اُس نے کلائی کی گھڑی اُٹھا کر وقت دیکھا۔نو بج رہے تھے۔چند بار اُس نے پھر دائیں بائیں پہلو بدلے۔ہاتھ بڑھا کر میز سے ٹرانسسٹر اُٹھایا۔مختلف سٹیشنوں کو ٹیون کرتا رہا۔کہیں سے کوئی اچھی چیز سُننے کو نہ ملی۔جھلا کر اُسے بند کیا اور وہیں رکھ دیا۔

رات اُس کی واپسی تین بجے کے قریب ہوئی تھی اور یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ جب وہ ڈھا کہ کلب سے گھر جانے کے لئے نکل رہا تھا اُس کا ٹکراؤ بادل سے ہوا جس نے گاڑی کی کھڑکی سے چہرہ نکال اُسے کہا۔

''میں تمہیں لینے آیا تھا۔''

''کہاں کاارادہ ہے؟'' اُس نے جواباً پُوچھا۔

''میرے پیچھے آؤ۔''

گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اُس نے جانے سے معذرت کی۔طاہرہ کی ناراضگی کا عُذر پیش کیا۔مگر بادل اُس وقت سچ مچ کا زوردار بادل بنا ہوا تھا جو اُس کے انکار کی صورت میں فوراًبرس پڑتا۔

''ہٹاؤ یار کیا بور کرتے ہو؟ میں تمہیں خاص طور پر لینے آیا تھا۔''

وہ جانتا تھابادل ٹلنے والی شےنہیں۔عافیت اِسی میں تھی کہ چُپ چاپ گاڑی اُس کے تعاقب میں ڈال دے۔

ڈھاکہ کینٹ میں کرنل غلام سرور کے ہاں محفلِ رنگ و بُو سجی ہوئی تھی۔راجن پور کا کرنل سرور جو بادل کا گہرایار تھا۔بڑا ہنس مکھ اور باغ و بہار شخصیت کا مالک تھا۔غائبانہ تعارف تو تھا پر ملاقات آج ہی ہوئی تھی۔اُس وقت جب پُوربی ہوائیں درختوں کے پتوں پھولوں کے بوٹوں اور گھاس کے قطعوں پر کسی نازک دوشیزہ کی مانند اٹھکیلیاں کرتی پھرتی تھیں۔کرنل سرور کی آواز چاروں کھونٹ پھیلی ہوئی تھی۔ظالم نے کیا گلا پایا تھا۔ٹیگور کا بنگلہ گیت یوں لگتا تھا جیسے آسمان سے کوئی فرشتہ اپنی لے میں ملکوتی نغمہ فضا میں بکھیر رہا ہے۔

تم اپنے راج سنگھاسن سے اُترے اور میری کُٹیا کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے۔

میں ایک کونے میں بالکل تنہا کھڑی گا رہی تھی۔میرا گیت تمہیں سنائی دیا۔تم میری کُٹیا کے دروازے پرآ کھڑے ہوئے۔

میرے سیدھے سادے گیت نے تمہارے پریم کوچُھولیا۔ایک پُھول انعام کے طور پر لے کرتم میری کُٹیا کے دروازے پرآ کھڑے ہوئے۔

لیکن اُس وقت غضب ہوگیا جب اُس نے ''راگنی آسا'' کا گیت گایا۔ اُسے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بے حس وحرکت ہو کر زمان ومکان کی قید سے آزاد ہوگیا ہے۔

جو گیت وہ گا رہا تھا۔ اُس کا مکمل مفہوم اُس کی گرفت میں نہیں آرہا تھا۔ غالبًا سرائیکی زبان تھی۔ لیکن اُس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ زبان کی مٹھاس، کرنل کی آواز کا سحر اور راگنی آسا۔

سچ تو یہ تھا کہ وہ سانس جانے کیسے لے رہا تھا؟

وہ اچھے گیتوں کا رَسیا تھا۔ اچھی آوازوں کا قدردان تھا۔ بنگالی ہونے کے باوجود وہ بے شمار زبانوں کے گیت سمجھتا اور اُنہیں شوق سے سُنتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب تین بجے کے قریب واپسی ہوئی اُس نے کرنل سرور کے ہاتھوں کو عقیدت سے اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔

''میں بادل کا شکر گزار ہوں کہ وہ مجھے یہاں لے آیا اور میں نے آپ کو سُنا۔ فوجیوں کے بارے میں میرے خیالات ''مُنّی سن'' سے مختلف نہیں کہ یہ بس مار دھاڑ والی شے ہیں۔ پر آپ کو سُن کر یہ احساس ہوا کہ فن کسی کی میراث نہیں۔''

گھر واپسی کا راستہ اُس نے خمار میں ڈوبے ڈوبے طے کیا۔ سویا بھی دیر سے اور جاگا بھی دیر سے۔

آج اتوار کا دن تھا۔ بچوں نے صُبح سے کمرے میں ایک بار بھی جھانکا تک نہ تھا۔ طاہرہ نے اُنہیں ڈانٹ ڈپٹ کر کسی کونے میں بٹھا رکھا ہوگا۔

نوکر نے اندر آکر ناشتے کے لئے پوچھا۔ اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''ناشتہ لگاؤ میں آرہا ہوں۔''

وہ جب کھانے کی میز پر آیا، نوکر چائے دانی کوٹی کوزی سے ڈھانپ رہا تھا۔
ٹی وی لاؤنج ویران تھا۔ استفسار پر نوکر نے بتایا کہ بچے ناشتہ کرنے کے بعد ابصار صاحب کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔ اُن کے بچے اُنہیں بلانے آئے تھے۔ بیگم صاحبہ سٹور میں ہیں۔ کل مارکیٹ سے خریدی گئی جنس کو ملازمہ کے ساتھ سمیٹنے میں مصروف ہیں۔

ٹوسٹ پر مکھن لگاتے ہوئے اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

''اِس بار طاہرہ رحمٰن تم روٹھنے میں سو فی صد حق بجانب ہو۔ کوئی بھی اچھی بیوی شوہر کا اتنی رات گئے تک باہر رہنا برداشت نہیں کرتی۔ میں تمہیں غصّے اور ناراضگی کے اِس حق سے محروم کرنا ہرگز پسند نہ کروں گا جو بیوی ہونے کے ناطے تمہیں حاصل ہے۔ پر مجھے اگر شکایت ہے تو بس اتنی کہ غصے کے اظہار کے لئے تم جو طرزِ عمل اختیار کرتی ہو وہ صرف بھونڈا ہی نہیں منفی بھی ہے۔ میں اب جب تمہیں منانے کی کوشش کروں گا تو جانتا ہوں تم کس قدر غُل غپاڑہ مچاؤ گی اور اِسی غُل غپاڑے سے میری جان جاتی ہے۔''

چائے کپ میں اُنڈیلی۔ اتنی گرم نہ تھی جتنی وہ پینے کا عادی تھا۔ ناشتے کا سارا مزہ کِرکرا ہو گیا تھا۔ بھنّاتے ہوئے اُس نے کپ میز پر پٹخا اور نوکر سے بولا۔

''اِس شربت کو پلانے کے لئے تم گھنٹہ بھر سے اپنی ٹانگیں توڑ رہے تھے۔''

نوکر نے مسکینی سے کہا۔

''صاحب میں نے اِسے ٹی کوزی سے اچھی طرح ڈھانپا تھا۔ میرا خیال تھا یہ کافی گرم رہے گی۔ آپ۔۔۔''

اُس کے ماتھے پر تین چار بَل پڑے۔ تُرشی سے اُس کی بات کاٹتے ہوئے وہ بولا۔

''بڑی ڈھیٹ ہڈی ہو تم۔ کتنی بار کہا ہے میرے سامنے فضول قسم کے عذر رلنگ

مت پیش کیا کرو۔‘‘

’’صاحب میں دو منٹ میں اور بنا لاتا ہوں۔‘‘

’’رہنے دو۔‘‘

اُس نے کپ ویسے ہی میز پر رکھ دیا اور اُٹھتے ہوئے بولا۔

’’جاؤ بچوں کو ابصار صاحب کے ہاں سے لے آؤ۔‘‘

ابصار صاحب انکے پارٹنر تھے۔بہت مخلص، ہمدرد اور ایمان دار سے ساتھی۔ رہنے والے تو میمن سنگھ کے تھے۔کوئی چھ سال قبل انہوں نے مسٹر خان کی پارٹنر شپ سے چائے کا کاروبار شروع کیا تھا۔مسٹر خان سرکاری ملازمت کی وجہ سے پسِ پردہ تھے پر وہ اُنہیں ساری سہولتیں اور مواقع فراہم کر رہے تھے جنہوں نے تھوڑے ہی عرصے میں اس کاروبار کو خاصا عروج دے دیا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں پہنچ کر لان میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا تبھی دو صحت مند بچے اُچھلتے شور مچاتے آ کر اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔باری باری اُن کے رُخساروں پر پیار کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

’’تم لوگ صبح سے کہاں غائب تھے؟میرے پاس کیوں نہیں آئے؟‘‘

’’پپا ہم لوگ موتی اور ڈبلو کے ساتھ لڈو کھیل رہے تھے۔آپ نے بلایا تو کھیل اُدھورا چھوڑ کر چلے آئے۔‘‘

لڑکی نے جو عمر میں لڑکے سے چھوٹی تھی آنکھیں گھمائیں اور ہونٹوں کو اُس کے پاس لاتے ہوئے پُر اسرار انداز میں بولی۔

’’پپا مما آپ سے ناراض ہیں؟‘‘

’’تمہاری ممی بہت خراب ہیں۔ہر وقت مجھ سے لڑتی رہتی ہیں میں نے اُنہیں گھر

سے نکال دینا ہے۔''

''ہائے پپا۔''

اُس نے دیکھا بیٹی کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ فوراً اُس نے اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹا۔ گالوں پر پیار کیا۔

''میری جان دوتی۔ کیوں پریشان ہوگئی ہو؟''

''پپا۔'' بچی نے اپنے ننھے منے ہاتھوں میں اُس کا چہرہ تھام لیا اور اُس کے گالوں پر پیار کرتے ہوئے بولی۔

''ہمیں کھانا کون کھلائے گا؟ ہمارے کپڑے کون سیئے گا۔ ہمیں سکول کون چھوڑنے جائے گا؟'' ہمیں باہر کون لے کر جائے گا؟

''بس تو اتنی سی بات کے لئے گھبرا گئی ہو۔ ارے بھئی کریم کھانا پکائے گا۔ نذرل میری بٹیا رانی کو سیر کروائے گا۔ اور ڈرائیور میری مُنی سی گڑیا کو سکول چھوڑ کر آئے گا۔''

''چھی چھی پاپا۔'' بچی نے بُرا سا منہ بنایا۔

''کریم کھانا پکائے گا۔ وہ بُہت گندا ہے میں اُس کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھاؤں گی۔''

چلو کاظم بابا سے کہیں گے وہ کھانا پکائے۔

''نہیں پپا آپ می کے ساتھ صُلح کر لیں۔''

''اچھا چلو تمہاری می کے پاس چلتے ہیں۔ وہ فیصلہ کریں گی۔''

اُس نے دونوں بچوں کی اُنگلیاں پکڑیں اور سٹور روم کی طرف چل پڑا۔

اور وہاں طاہرہ رحمٰن چاول دالوں اور چینی کے ذخیرے میں گھری بیٹھی تھی۔

سٹور کے چھوٹے سے دروازے میں ٹھہر کر اُس نے ناک سے سُوں سُوں کی

زوردار آوازیں نکالیں اور بولا۔

''بچو پھر نہ کہنا۔ پولیس پکڑ کر لے جائے گی تمہاری ماں کو۔ ذخیرہ اندوزی شروع کردی ہے اُس نے۔''

دالوں کو مختلف ڈبوں میں سینتی ہوئی ملازمہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بیٹے اور بیٹی نے بھی قہقہہ لگایا۔ پر وہ چہرے پر برہمی کے آثار لئے بیٹھی رہی۔ اور پھر یوں ہوا کہ ملازمہ باہر چلی گئی۔ بچوں کو بھی اُس نے بہلا پھسلا کر کھیلنے کے لئے بھیج دیا اور رات کلب میں گالا نائٹ منانے اور راگنی آسا کے گیت سُننے کا معاوضہ اُسے ڈیڑھ دو گھنٹہ کی مسلسل منت وخوشامد اور طاہرہ رحمٰن کی کڑوی کسیلی باتیں سُن کر صبر کرنے کی شکل میں ادا کرنا پڑا۔

اور شام کو جب اُس نے باہر جانے کے لئے گاڑی نکالی تو ''بنانی'' کی اُس نسبتاً ویران سڑک پر گاڑی روکے سٹیرنگ پر سر رکھے وہ کتنی دیر تک صرف یہ سوچتا رہا کہ یہ شام کہاں گزاری جائے؟

ہیلن مارلے کے ہاں۔ صبیحہ کے پاس یا مسز امجد کے گھر۔ دیر بعد اُس نے سر اُٹھایا۔ سڑک کی ویرانی کو گھورا اور چابی گھماتے ہوئے بڑبڑایا۔

''لعنت بھیجو اِن سبھوں پر۔ سوسائٹی گرلز ایک سے ایک بڑھ کر فلرٹ۔ اور جب وہ ایک لمبی ڈرائیو کے بعد واپس آرہا تھا تو وہ تشنہ سی آرزو اُس کے لبوں پر پھڑپھڑائی جو اکثر وبیشتر اُسے بے چین رکھتی تھی۔

''جی چاہتا ہے ایک معصوم بھولی بھالی اور دیوقسم کی لڑکی میری دوست ہو۔''

باب نمبر ۶:

ماں جی کہا کرتی تھیں قیامت کے روز سُورج سوا نیزے پر آ جائے گا۔ پر مجھے تو یہ آج ہی سوا نیزے پر آیا ہوا لگتا ہے۔

جُون کی چلچلاتی دوپہر میں جب زمین بھٹی میں دانوں کی طرح بھُن رہی تھی وہ گھر کی چھت کی دیوار کے چھوٹے سے سائے میں بیٹھی کسی بھارتی مصنّف کا ایک فضول سا ناول پڑھنے میں لگی ہوئی تھی۔ یہ ناول اُسے اپنی کلاس فیلو سے ملا تھا جس نے اُسے دیتے ہوئے اُس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے تھے۔

اُس نے تو جتنے صفحے پڑھے تھے۔ سر پیر کا ہی پتہ نہیں چلتا تھا۔ شاید اِس کی ایک وجہ اُس کا وہ خوف بھی ہو جو اُس کے اعصاب پر سوار تھا کہ گھر کا کوئی فرد اگر اُوپر آ گیا اور اُس کے ہاتھ میں ایسی فضول کتاب دیکھ لی تو سمجھ لو اُس کی خیر نہیں۔

یقیناً یہی وجہ تھی کہ اُس کی توجہ بٹی ہوئی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ اٹھتی۔ چھت پر آنے والی سیڑھیوں کو دیکھتی کہ کہیں کوئی کسی خاص ضرورت سے بالائی منزل پر تو نہیں آ رہا۔ جونہی اطمینان ہوتا واپس جا کر کتاب سے اُلجھنے لگتی۔

لُو کا ایک جھونکا آتا تو اُس کے پسینے میں ڈوبے جسم کو ٹھنڈک کا احساس دینے کے ساتھ ساتھ اُس کے نتھنوں میں اُس بُو کو بھی گھُسیڑ جاتا جو اُس کے گریبان سے اُٹھ اُٹھ کر اُس کے چہرے کی طرف آتی تھی۔ کھٹی ڈکاروں جیسی یہ بُو اُسے ہر بار یہ یاد دلاتی کہ اُس نے دو دن سے غسل نہیں کیا ہے۔

کہانی پھر گڈ مُڈ ہونے لگی تھی۔ جب سے اُس میں آشا اور پران کود پڑے تھے یا یہ محض اُس کا خیال تھا۔ ویسے ناول اُسے اپنی ذہنی سطح سے اُونچا محسوس ہو رہا تھا۔

لیکن اِن سب کے علاوہ بھی ایک بات تھی جو بار بار اُس کا دھیان کتاب کے صفحات سے اُکھڑ وا رہی تھی ۔کبھی خُوشی اور اندرونی سکون کا دلکش رنگ اُس کے چہرے پر پھیل کر اُسے لال گُلال کر ڈالتا ۔کبھی ندامت اور پریشانی کے عکس وہاں ویرانیاں بکھیر دیتے ۔کبھی دل اور دماغ میں زوردار جنگ شروع ہو جاتی ۔دونوں ہی ''اچھا کیا'' اور ''نہیں اچھا کیا'' کی زد میں تھے ۔

جب دماغ اتنے بکھیڑوں میں اُلجھا ہُوا ہو،اُلٹی پُلٹی سوچوں میں پھنسا ہوا ہو۔تب کہانی نے خاک پلّے پڑنا تھا ۔اب ورقوں کو پیچھے کی جانب بار بار پلٹاؤ اور وہاں کیا لکھا تھا؟ جیسے سوالوں کی تکرار ہی ہوتی تھی ۔

وہ جھنجھلا اُٹھی ۔اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی یوں جیسے اپنا کیس دل کی عدالت میں پیش کیا ہو اور ضمیر کے جج کے سامنے صفائی میں دلائل پر دلائل دیئے جا رہی ہو ۔

''ٹھیک ہی تو کیا ہے میں نے ۔ایک اُٹھتا ہے تو کُند ذہن کا خطاب دیتا ہے ۔دوسرا کہتا ہے دماغ میں بُھس بھرا ہوا ہے ۔تیسرے کو اعتراض ہے کہ نالائق برتن مانجھنے جوگی رہ جائے گی ۔''

ارے میں کوئی کُند ذہن ہوں؟ پتہ نہیں کیوں سارے میرے ہی پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گئے ہیں ۔اب اگر میرا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تو بھلا اِس میں میرا کیا قُصور؟

میں بھی دیکھوں گی دونوں کو اب ۔بھلا کتابوں کے بغیر کیسے سبق سنائیں گی ماموں حمید کو ۔کتابیں تو میں نے وہاں پہنچا دی ہیں کہ ڈھونڈ تے ڈھونڈ تے مر بھی جائیں تب بھی نہ ملیں ۔

اُس وقت وہ گرم پانی کی طرح کھول رہی تھی ۔غم و غصے کے اُبال اُٹھ رہے تھے ۔جلن سے بُرا حال تھا ۔پر تھوڑی دیر بعد جیسے کسی نے چٹکی کاٹ لی ۔

''اچھا نہیں کیا تم نے ۔ مار پڑے گی انہیں جب کتابیں نہیں ملیں گی ۔ اماں الگ فضیحتا کریں گی ۔''بس تو چھوٹا سا دل ڈوبنے لگا تھا ۔

قصہ یوں تھا کہ اُس بڑے سے گھر میں جس کے بے شمار کمروں میں ڈھیر سارے لوگ رہتے تھے ۔ اُس گیارہ بارہ سالہ لڑکی کی رائی برابر بھی اہمیت نہیں تھی ۔ یہ دو منزلہ گھر جو اردگرد کے علاقے میں بڑی حویلی کے نام سے جانا جاتا تھا ۔ تقریباً سارا اُس کی ننہال کے قبضے میں تھا ۔ اُوپر کی منزل کا ایک کمرہ اور اُس کے ساتھ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ اُس کی ماں کے پاس تھا جہاں وہ اپنے چھ بچوں کے ساتھ رہتی تھی ۔

اُس کا باپ فوج میں لانس نائیک تھا ۔ وہ لوگ کبھی اُس کے ساتھ اُس کی ملازمت پر نہ گئے ۔ تنخواہ جو تھوڑی تھی ۔ اُسے یاد تھا ۔ بچپن میں جب اُس کا باپ سالانہ چھٹی کاٹ کر واپس جانے لگتا تو وہ اُس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی اور اُس کے ساتھ جانے کی ضد کرتی جس پر اُس کی ماں ڈانٹ ڈپٹ کرتی ، تب باپ کہتا ۔

''مت ڈانٹو بچے ہیں نا ۔ بڑے ہو کر سب سمجھ جائیں گے ۔''

اُس کے والدین جہاں غُربت کی دلدل میں گھٹنوں گھٹنوں تک پھنسے ہوئے تھے ۔ وہیں اُس کے ننہال والوں پر دولت مُنہ کی طرح برستی تھی ۔ اُس کے چاروں ماموں اعلیٰ ملازمتوں پر فائز تھے ۔ سب سے بڑے گلگت کے ملٹری اسپتال کے ایڈمنسٹریٹو تھے اور گلگت میں پیدا ہونے والی اور پائی جانے والی ہر چیز اُس گھر میں تھوک کے حساب سے دیکھی جا سکتی تھی ۔ خشک میووں کے کنستر سٹور روم میں قطار در قطار پڑے رہتے ۔ اُس کی چھوٹی خالہ دن میں جب کبھی سٹور میں جاتی تو باہر نکلتے ہوئے اکثر اُس کی دونوں مُٹھیاں میوے سے بھری ہوتیں جنہیں وہ انگنائی میں کھیلتے بچوں کی ہتھیلیوں پر تھوڑا تھوڑا یوں رکھتیں جیسے دروازے پر کھڑے فقیر کے پھیلے کشکول میں نخرے والی گھر گھرہستن مُٹھی بھر آٹا ڈال

دے۔

''اتنا تھوڑا سا۔'' وہ خود سے کہتی۔

ایک پھکا لگتا اور ہتھیلی خالی ہو جاتی۔ اُس کی گرسنہ نگاہیں سٹور کے بند دروازے کو گھورتیں۔ حسرت کے عکس وہاں نظر آتے۔ تب اُسے وہ سلیمانی ٹوپی یاد آتی جس کے متعلق اُس نے بے شمار کہانیوں میں پڑھا تھا۔

''اے کاش وہ ٹوپی کہیں میرے ہاتھ لگ جائے تو بس وارے نیارے ہو جائیں۔ سر پر رکھوں اور سٹور میں گھس جاؤں۔ پہلی ڈبکی تو کالے شہتوتوں کے کنستر میں لگاؤں اور سارے ہڑپ کر جاؤں۔ گری والی خوبانیاں تو ایک نہ چھوڑوں۔''

وہ ذائقوں کے تصور میں چٹخارے لے لے کر خود سے باتیں کیے چلی جاتی۔

اُس کا چھوٹا سا ذہن بہت سی باتیں سوچتا رہتا۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنے بھائیوں اور بڑی بہن سے پُوچھے کہ اُس کے ماموؤں کے پاس ڈھیر سارے پیسے کیوں ہیں؟ اور اُس کے ابا کے پاس کیوں نہیں؟

لیکن وہ اُن سے بہت ڈرتی تھی۔ جب بھی ایسا کوئی سوال اُس نے پُوچھنا چاہا اُسے دھتکار دیا گیا۔ اُس کا مذاق اُڑایا گیا۔ ایک بار اُس کے ایسے ہی کسی سوال پر اُس کے تیسرے نمبر کے بھائی نے کہا۔

''ارے یہ کارل مارکس کی رُوح اس گھر میں کہاں سے آ گئی؟''

پر بڑے بھائی اور بڑی بہن نے دونوں کو ڈانٹا اور اُسے اپنے پاس بٹھا کر نرمی سے بتانا شروع کیا۔

''ہمارے ماموں اُونچے عہدوں پر بیٹھے ہیں۔ اُن کی موٹی موٹی تنخواہیں ہیں۔ وہ امیر ہیں کیونکہ اُنہوں نے محنت کی۔ ہمارے نانا چھوٹے سے کاشتکار تھے۔ ہمارے

ماموں سات کوس کا راستہ پیدل چل کر سکول جاتے۔ تپتی دوپہروں اور خون جمانے والی سہ پہروں میں سکول سے واپس آ کر باپ کے ساتھ کھیتی باڑی میں اُن کا ہاتھ بٹاتے۔ پانی کی باری پر آدھی آدھی رات تک جاگتے۔ لالٹین کی روشنی میں گھنٹوں پڑھتے۔ مشقت اُن کی گھٹی میں پڑی۔ ایسے میں اللہ کی مدد بھی شاملِ حال ہوئی۔ کل جن کٹھنائیوں میں سے اُنہوں نے خود کو گذارا۔ آج وہ اُن کا پھل کھا رہے ہیں۔

اُس کا بڑا بھائی چند لمحوں کیلئے بات کرتے کرتے رُکا۔ ہنسا اور پھر بولا۔

اب رہے ہمارے ابا۔ ایک تو وہ اپنی ماں بہنوں کے لاڈلے، اُوپر سے کام چور۔ پڑھنے جاتے تو لڑکوں سے لڑ جھگڑ کر گھر آ جاتے۔ ماں بہنیں لعن طعن کرنے کی بجائے اُلٹا اُنہیں شہہ دیتیں۔ ایسے بگڑے ہوئے بچے جب نہیں پڑھتے تو پھر زندگی میں دھکے کھانا اُن کا نصیب بنتا ہے۔ اپنے مقدر کے دھکوں میں اُنہوں نے ہمیں بھی شامل کر لیا ہے۔ ہم بھی کولہو کے بیل کی طرح اچھے دنوں کی اُمید میں اپنے مدار پر چکر کاٹے جا رہے ہیں۔''

ماں بھی وہیں پاس ہی بیٹھی یہ سب سُن رہی تھی۔ بیٹا جونہی خاموش ہوا۔ وہ اپنے اندر کی دُس گھولتی تلخیاں ہونٹوں پر لائے بغیر نہ رہ سکی۔

''میں تو شاید حرام کی تھی۔ کوڑے کے ڈھیر پر سے اُٹھائی گئی تھی۔ آنکھیں بند کر کے جہنم میں جھونک دیا۔ میرے لئے شاید لوگوں کا قحط پڑ گیا تھا۔ کھاتے پیتے لوگوں کو موت آ گئی تھی۔''

وہ اپنی ماں اور بڑی بہنوں کے خلاف زہر اُگل رہی تھی۔

''ماں۔''

بڑا بیٹا کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

''خوش رہا کرو۔ تمہارا خالہ زاد، چچا زاد ہے۔ ہر بندے کا اپنا اپنا نصیب ہوتا

ہے۔آپ اگر ابا کے مقدر میں نہ لکھی جاتیں تو ہم جیسے بچے آپ کو کہاں سے ملتے۔''

''بس تو بچے اِسی نصیب کے لکھے کو تو بھوگ رہی ہوں۔''

اُس کے اندر کا کرب جیسے بلبلا تا ہوا چھلک چھلک کر باہر نکل رہا تھا۔

حالات کے اِس جبر نے ماں کے اندر بُہت سی تلخیوں کو جنم دے رکھا تھا۔روز مرّہ معمولات میں اکثر و بیشتر اُس کا رویہ جارحانہ سا ہوتا۔ماں بہنوں سے بول چال بھی بند رکھتی۔ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی اچھے ہمسایوں جیسے تعلقات نہ ہوتے۔چھوٹی موٹی اشیاء جیسے چینی، پتی، آٹا اور دال وغیرہ کا لین دین بھی بُہت کم ہوتا۔

سال بعد جب اُسکے ماموں اپنے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پھلوں کے ٹوکروں اور دیگر سوغاتوں سے لدے پھندے چھٹیاں گزارنے گھر آتے تب ایک تھال میں مختلف چیزیں سجا کر اُس کی ماں کو بھیجی جاتیں۔دینے اور لینے کا یہ مرحلہ کس قدر جانگسل ہوتا۔اِس کی سنگینی کا اندازہ اُس سے بڑھ کر کسی کو نہیں تھا۔دعائیں مانگتے مانگتے اُس کی زبان خشک ہونے لگتی۔

''اللہ ماں پھل واپس نہ کرے۔''

پر یہ دعائیں بُہت کم قبول ہوتیں۔ماں کا طنزیہ ہنکارہ کمرے میں گونجتا۔

''بھوکی نہیں ہوں اِن چیزوں کی۔''

تھال ویسے ہی لوٹا دیا جاتا جیسے آتا۔وہ بس ٹکر ٹکر صورتِ حال کو دیکھتی۔آنگن میں کھڑی ناخنوں کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اُس کے بڑے ماموں جو لڑائی جھگڑوں کی تفصیل سے کم ہی دلچسپی لیتے تھے اُس کی ماں کو خود چیزیں دینے آجاتے۔تب ماں انکار نہ کر پاتی اور چُپ چُپاتے تھال یا سینی رکھ لیتی۔

وہ ماں سے دَھپ دَھپ مار کھاتی۔ بہن بھائیوں سے پٹتی ۔کزنز کی اُلٹی سیدھی باتیں سُنتی ۔دل ہی دل میں کڑھتی پر کچھ نہ کر پاتی ۔

ایک مصیبت یہ بھی تو تھی کہ وہ پڑھنے لکھنے میں بھی بڑی نکمی تھی ۔دماغ جانے کیسا تھا کہ اُس میں نصابی چیز تو کوئی گھستی نہ تھی ۔ہاں اِدھر اُدھر کی فضول باتوں کے لئے بہتیری گنجائش تھی وہاں ۔

خالو حمید اُس کی چوتھے نمبر والی خالہ کے شوہر بڑے صُلح کُل قسم کی شخصیت تھے ۔ اُن کا معمول تھا کہ وہ گھر کے سب بچوں کو ہر روز شام کو دو تین گھنٹے پڑھاتے ۔اُسے بھی مجبوراً سب کے ساتھ بیٹھنا پڑتا ۔جب وہ اِس سارے وقت میں دو سوال بھی صحیح حل نہ کر پاتی تو وہ جھلا کر کہتے ۔

''کتنی کوڑھ مغز لڑکی ہے یہ۔''

اُس وقت اُس کی آنکھوں میں پانی اُتر آتا ۔

جب وہ اُسے سمجھانے کی کوشش کرتے ۔اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے دماغ تک پہنچنے کے سبھی راستے بلاک ہو گئے ہیں ۔کوئی چھوٹی موٹی درز یا دراڑ بھی نہیں ہے جن میں سے سمجھایا ہوا اندر جا سکے ۔

تب پھوپھا حمید کی کُرسی کے پاس کھڑی کاپی پر نظریں جمائے صرف یہ سوچتی کہ وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑے ۔اُس کا سر پھٹ جائے ،خون بہنے لگے ،بیہوش ہو جائے ۔ تب سارا گھر اُس کے گرد اکٹھا ہو جائے ۔پھر کتنے دن وہ بستر پر پڑی رہے ۔اُس کی خوب خاطر مدارت ہو ۔

پر وہ یہ سب سوچتی اور کچھ نہ کر پاتی ۔

اُس کی بہن اور کزن کو اچھا کام کرنے پر ہر روز شاباش ملتی ۔وہ اِس روز روز کی

بِکل بکل سے تنگ آ گئی تھی ۔اُنہیں زچ کرنے کی کئی ترکیبیں اُس کے ذہن میں آتیں ۔پر عمل کی کسوٹی پر پرکھتی تو پھُسپھُسی نظر آتیں ۔وہ اُن دونوں کو سزا دینا چاہتی تھی ۔پریشان کرنے کی خواہش مند تھی ۔جلانے اور تڑپانے کی آرزومند تھی ۔

اور پھر اُس نے ایک دن اُن کی کتابیں غائب کر دینے کا سوچا ۔یہ تجویز اُسے سہل لگنے کے ساتھ ساتھ معقول بھی لگی ۔

اور اُس دوپہر جب گھر کے سب افراد گرمی سے بچنے کے لئے نچلی منزل میں جمع تھے ۔اُس نے احتیاط سے اپنی بڑی بہن اور کزن کے بستے اُٹھائے اور اپنے کمرے کی بڑی پیٹی کے پیچھے پھینک دیئے ۔تسکین کا لمبا سانس بھرا اور اپنے آپ سے کہا۔

''اب دیکھوں گی میں اُنہیں ۔نہ ہوگا بانس اور نہ بجے گی بانسریا ۔''

باب نمبر ۷:

''مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ اگر میں پیدا نہ ہوتی تو خدا کی اِس وسیع کائنات میں کیا کمی رہ جاتی؟''

یہ دُھند اور کُہر میں ڈوبی ہوئی ایک صُبح تھی اور وہ اسکول جا رہی تھی۔ اُس کے پاؤں میں تین چار روپے کی ایک سستی سی چپل تھی۔ جسم پر سستی سی کاٹن کا سفید سوٹ، اُس پر گھٹیا سی اُون کی عنابی جرسی اور سر پر موٹی ململ کا ڈوپٹہ تھا۔ سردی کی شدت سے اُس کے ناک کی پھُنگی بے حد سُرخ ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں نمی تیرتی پھرتی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ کپڑے کے ایک چھوٹے ٹکڑے سے جسے اُس نے رُومال کے طور پر ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اپنی ناک اور آنکھیں صاف کرتی۔

یہ گلی بڑی ویران سی تھی۔ وہ ہمیشہ اِسی گلی سے گزر کر اسکول جاتی۔ یہ شارٹ کٹ ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کی خود کلامی کے لئے بھی موزوں جگہ تھی۔ بہن بھائیوں، ماں باپ، رشتہ داروں اور خُدا سے شکووں کی بھڑاس چلتے چلتے بڑ بڑاہٹوں کی صورت میں یہیں نکلتی۔

''اے اللہ آج تو غضب کی سردی ہے۔''

بس اسٹاپ پر شہر کو جانے والے لڑکے لڑکیوں کا مجمع حسبِ معمول کھڑا نظر آیا اور کوٹوں کارڈیگنوں گرم چادروں اور اُونی شالوں میں لپٹے ہوئے وجود اپنے آپ پر اتنا کچھ چڑھانے کے باوجود دانت کٹکٹا رہے ہوتے۔ اُن کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ خود سے کہے بغیر نہ رہ سکتی۔

''اِس قدر مدافعتی سامان کے باوجود اگر اِن کا یہ حال ہے تو پھر مجھے تو مر جانا

چاہیے۔"

خوبصورت رنگوں والے کارڈیگن، کوٹ، خوشنما شالیں، قیمتی کپڑے اور نرم گرم جُوتے پہننے کی تشنہ آرزوئیں اُس کے اندر ایک تواتر کے ساتھ اُترنے لگتیں۔ اُن کی اُترائی کا سلسلہ کبھی کبھار اتنی سُرعت سے ہوتا کہ اُس کا اندر جلنے لگتا۔ ذہن میں اُبلتے پانی کی طرح کھولاؤ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ کچھ دیر تک جلنے، کھولنے اور تلملانے کے بعد وہ اپنی اُس خیالی دُنیا میں پہنچ جاتی جو اُس نے اپنے اردگرد بنا رکھی تھی۔ جس میں داخل ہو کر وہ وقتی طور پر اُن تلخیوں کو بُھول جاتی جو ہمہ وقت اُس کے دل و دماغ پر گھٹاؤں کی طرح چھائی رہتیں۔

وہ جس ہائی سکول میں پڑھتی تھی کہنے کو وہ ایک فلاحی ادارے کے زیرِ اہتمام تھا پر اُونچا سٹینڈرڈ رکھتا تھا۔ ٹیچرز اعلیٰ تعلیم یافتہ، فیشن ایبل اور خاصی خُوش شکل تھیں۔ خوابوں کے جزیروں میں تیرتی کشتیوں میں اب وہ الٹرا موڈ اُستانیاں سوار ہو جاتیں۔ فسٹ ایئر انجینئرنگ فورتھ ایئر اور میڈیکل میں پڑھنے والے اُس کے سُوکھے سڑیل سے بھائی دیکھتے ہی دیکھتے گھبرو جوان بن جاتے۔ خوبصورت اور صحت مند نوجوان کوئی ڈاکٹر ہوتا تو کوئی انجینئر۔ اُن کی مردانہ وجاہت ٹپک ٹپک پڑتی۔ اُن کی قابلیت کی چاروں کھونٹ دُھوم مچی ہوئی ہوتی۔

کہانی اب کچھ اِس انداز میں آگے بڑھتی کہ وہ اِن وجیہہ جوانوں کی بے حد لاڈلی اور چہیتی بہن ہوتی ہے۔ اکلوتی اور دُلاری بہن۔ اپنی دوسری بہن کے وجود کو وہ ایک پل کے لئے بھی اپنی اِس جنت میں برداشت نہ کر سکتی۔ تصورات کا اُفق پھیلتا چلا جاتا۔ یوں کہ اُسکی پسندیدہ ٹیچرز اُس کے بھائیوں سے پیار کرتیں۔

اور کلائمیکس کچھ یوں ہوتا کہ اُنہیں جب پتہ چلتا کہ اُن کی کلاس میں پڑھنے والی لڑکی اُن کے محبوب کی چہیتی بہن ہے تو وہ آناً فاناً اُن کی آنکھ کا تارا بن جاتی۔ کلاس کی

لڑکیاں مارے حسد اور جلن کے انگاروں پر لوٹ لوٹ جاتیں اور وہ اِن سب لڑکیوں سے گِن گِن کر بدلے لیتی جو اُسے اچھا نہیں سمجھتی تھیں۔ امتحان میں آنے والے سوالات اور پرچوں کی مارکنگ کا بھی اُسے علم ہوتا۔ لڑکیاں سوال جاننے کے لئے اُس کی منتیں کرتیں۔ اُس کے آگے پیچھے چکر کاٹتیں اور وہ اتراتی پھرتی۔

پر یہ اِترا ہٹ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی جب وہ گیٹ میں داخل ہوتی۔ کلاس رُوم میں سب سے پچھلی سیٹ پر بستہ رکھ کر ریاضی کا ہوم ورک کرنے کے لئے کسی لڑکی کی کاپی مانگنے کے لئے اُس کی منّت سماجت کرتی۔ جلدی جلدی اُلٹا سیدھا اُتارتی کہ مار سے بچ سکے۔ تاریخ جغرافیہ کی گھنٹی میں اپنا چہرہ مِس کی نظر سے بچاتی پھرتی اور جب اسکول آف ہو جاتا تو سُکھ کا لمبا سانس یُوں بھرتی جیسے قید با مشقت سے خلاصی ہوئی ہو۔ کتابیں بازوؤں میں بھر کر شکستہ حال چلتی گھر آجاتی۔

اُس دن ہفتہ تھا۔ اُس کے پاس کپڑوں کا ایک ہی جوڑا تھا اور وہ بُہت گندہ ہو رہا تھا۔ بڑی خجالت محسوس ہوئی۔ سارا دن اُسکول میں بھی چھپتی پھری۔ تفریح میں بھی باہر نہ نکلی۔ اپنے ڈیسک پر ہی بیٹھی رہی۔ گھر آتے ہی وہ پھٹ پڑی۔ اماں خرچ پر کہیں پہلے ہی جلی بھُنی بیٹھی تھی۔ غُصے میں بولیں۔

''کہاں سے پُورے کروں تمہارے اخراجات؟ فیسیں دوں، کتابیں مہیا کروں، کپڑے بنا کردوں، کھانے کا سامان لاؤں۔ ڈیڑھ سو روپلی میں کیا ننگی نہائے اور کیا نچوڑے۔ باوا کو لکھو مجھ سے کیا کہتی ہو۔''

غصّے سے اُس نے پاؤں فرش پر یوں مارے جیسے اُسے توڑ دینا چاہتی ہو۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں کے راستے سینے پر جذب ہو رہے تھے۔

وہ ہلک ہٹ پر اُتری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مچل مچل کر کہہ رہی تھی۔

''مجھے نہیں معلوم جہاں سے مرضی پیسے لاؤ۔ مجھے ایک جوڑا کپڑوں کا اور ایک جُوتی چاہیے۔ میں یہ کپڑے پہن کر اب اسکول نہیں جاؤں گی۔ ذرا دیکھو تو جُوتے کا سارا تلہ گھِس گیا ہے۔ ٹانکے ٹوٹ گئے ہیں۔ مجھے شرم آتی ہے۔''

اور اماں کسی جنگلی بھینسے کی طرح دھاڑیں۔

''یوں کرو مجھے بیچ آؤ کسی دوکان پر۔''

اُس وقت اماں کی قہر آلود نگاہیں کسی برچھی کی مانند اُس کے آر پار ہوئی جاتی تھیں۔

اُس کا نمبر دو بھائی جو اِسی سال انجینئرنگ کالج میں داخل ہوا تھا۔ ہنستے ہوئے بولا۔

''اماں تمہارا تو کسی نے ایک روپیہ بھی نہیں دینا۔''

اور اماں نے کوسنوں اور صلواتوں کا جو لمبا چوڑا سلسلہ شُروع کیا اُس نے اُسے اور بھی تپ پا کر دیا۔ جی چاہ رہا تھا اماں کے چیختے چنگھاڑتے گلے میں کوئی چیز ٹھونس دے۔

پر وہ جو کہتے ہیں قہر درویش بر جان درویش والا معاملہ تھا۔ اپنے ہی آنسوؤں کو پیتی ماں کو قہر آلود نگاہوں سے گھورتی وہ بُھوکی ہی چھت پر چلی گئی۔

اور پھر یوں ہوا کہ وہ پاگل سی لڑکی جو ہمہ وقت اپنی غُربت پر کُڑھنے، دوسروں سے جلنے اور خیالی دُنیا میں گم رہنے پر سارا وقت صَرف کرتی تھی وہ جو اپنے سب بہن بھائیوں کے مقابلے میں پڑھائی میں بہت نکمّی اور نالائق خیال کی جاتی تھی۔ اُس نے یوں کایا پلٹی کہ سبھوں کو حیران کر گئی۔ کیا گھر اور کیا اسکول ہر ایک انگشتِ بدنداں تھا۔

ہوا یوں تھا کہ اُس کی بڑی بہن ایف۔ ایس۔ سی کے امتحان میں صوبے بھر میں اوّل آئی تھی۔ اُس کے حاصل کردہ نمبروں نے گزشتہ تیس سالوں کا ریکارڈ توڑا تھا۔

اخبارات میں نہ صرف اُس کی تصاویر چھپیں بلکہ اخباری نمائندوں نے اُس کے خیالات مثلاً وہ مستقبل میں ڈاکٹر بنے گی ۔اُس کا ارادہ ہارٹ سرجری میں سپیشلائزیشن کرنے کے لئے امریکہ جانے کا ہے۔نیز وہ میڈیکل کو دولت بنانے کا ذریعہ بنانا نہیں چاہتی بلکہ اُس کے عزائم اِس پیشے کے وسیلے سے دُکھی انسانیت کے زخموں پر مرہم لگانے کے ہیں۔وغیرہ کو خوب بڑھا چڑھا کر لکھا گیا۔اُس نے یہ سب پڑھا۔اپنی خوبصورت کومل سی ناک کو نخوت سے سکیڑا اور نفرت بھرا ہنکارہ بھرتے ہوئے خود سے بولی۔

''پکوڑا جیسی ناک اور چُندھی آنکھوں والی یہ امریکہ جائے گی۔کیا کہنے ہیں اِس کے۔''

وہ گھر کی فضا کو یکسر بدلا ہوا دیکھ رہی تھی۔اُس کی خالائیں حتیٰ کہ اپنی ذات سے حد درجہ پیار کرنے والی خود غرض سی اُس کی نانی بھی رنگین پایوں والے سُوت کے بنے ہوئے پلنگ پر تکیے سے ٹیک لگائے اِس فخر و انبساط سے چہرہ پُھلائے اپنے ہمسایوں،عزیز رشتہ داروں اور ملنے جُلنے والوں سے مبارکبادیں وصول کر رہی ہیں۔خوش ہو رہی ہیں اور اُس کی بہن کو داد و تحسین کی نظروں سے دیکھ رہی ہیں اور بار بار کہتی ہیں۔

''بھئی آفرین ہے اِس لڑکی پر۔ہمارا تو نام روشن کر دیا ہے اِس نے۔''

اُس کی ماں بھی اپنی ناراضگی اور گِلے شکوے بُھول کر صحن میں رنگین پیڑھی پر بیٹھی اپنے دیور،دیورانیوں،نندوں اور ماں بہنوں سے باتیں کرتے ہوئے خوشی سے کِھلی پڑتی تھیں۔

''اللہ حیاتی دے میرے بچوں کو۔اُس کی رحمت اور عنایت سے سارے ہی ہونہار ہیں۔بس اِس طرف سے دل کو بے چینی لگی رہتی ہے۔کہیں یہ بھی انسان بن جائے تو اس پروردگار کا سو سو بار شکر ادا کروں۔''

ماں نے کسی قدر تاسف اور دُکھ سے اُسے دیکھا تھا۔ماں کی دید کا یہ انداز اُسے گھائل کر گیا۔جی چاہا کہ اُسے کھری کھری سُنا دے۔کہے کہ مجھے کیا ہوا ہے؟میری طرف سے کیسا اضطراب ہے؟

لیکن وہ یہ سب کہہ نہ سکی۔بس چُپ چاپ ماں کو غُصے اور نفرت سے گھورتی رہی۔

تب اِس نکمّی اور نالائق لڑکی نے ایک بُہت بڑا اہم فیصلہ اپنے آپ سے کیا۔سر جھٹکا، خیالی سپنوں اور خوابوں کی جنت کو اُٹھا کر کہیں دُور پھینکا اور اپنے آپ کو کتابوں کی دُنیا میں گُم کر دیا۔

باب نمبر ۸:

موسم تو ستم ڈھانے پر اُترا ہوا تھا۔ اِس شاندار کالج کے لمبے چوڑے سرسبز و شاداب ہر سُو طراوت اور تازگی کا فرحت آگیں احساس بخشتے لان و موسم کے حُسن اور رعنائی کو اور قاتل بنا رہے تھے۔ پچھمی ہوائیں سرو کے بوٹوں اور جامن کے پیڑوں پر سبک خرامی سے بہہ رہی تھیں۔ نیلا شفاف آسمان چیختے چنگھاڑتے بادلوں سے ڈھپا ہوا تھا۔ گھنے بادل جو کسی بھی پل زمین پر وارد ہونے کے انتظار میں مست ہاتھیوں کی طرح جھولتے جھومتے پھر رہے تھے۔

ایسے ہوشربا موسم میں وہ سنگِ مرمر کی بنچ پر بیٹھی جلنے کڑھنے اور اپنا خُون آپ ہی پینے میں جُتی ہوئی تھی۔ وہ دیوانی تھی ایسے موسم کی۔ سدا ہی چاہتی کہ نیلا آسمان گہری اُودی گھٹاؤں کے پیرہن پہنے رکھے۔ سورج کی شکل نظر نہ آئے۔ اُجالے اور اندھیرے کے درمیانی عکس کی چادر فضا پر تنی رہے جاڑوں میں جب موسم کی یہ کیفیت ہوتی۔ اُس کے بہن بھائی سردی سے دانت کٹکٹاتے ہوئے کہتے۔

''خدایا اب رحم کر۔ سورج کی صورت دکھا۔''

اُسے غُصہ آتا جھلا کر وہ کہتی۔

''کیا تکلیف ہے تمہیں۔ بد ذوق کہیں کے۔''

اور وہ سب پنجے جھاڑ کر اُس کے پیچھے پڑ جاتے۔

''یہاں کیا کر رہی ہو؟ دفع ہو جاؤ لندن۔ جی بھر کر لُطف اندوز ہونا دُھند اور کہر سے۔''

پر آج موسم کی دلکشی اور حُسن کا اُس پر قطعاً کوئی اثر نہیں تھا۔ گراؤنڈ میں

لڑکیوں کے غول گھوم پھر رہے تھے۔ ہنسی مذاق اور چہلوں کا سلسلہ جاری تھا۔ لڑکیاں اپنی لابنی گردنوں پر ٹکے سروں کو آسمان کی طرف کرتیں۔ موسم کی دلکشی اور رنگینی کا اعتراف نگاہوں سے کرتیں اور زبان سے بھی یہ کہنا نہ بھولتیں۔

''مائی گاڈ! موسم نے کیا غضب ڈھا رکھا ہے۔''

اُسے نفرت تھی اِن لڑکیوں سے جن کے خوبصورتی سے ترشے بال اُن کے شانوں پر ہلکورے کھاتے تھے۔ جن کے صبیح چہروں پر لالیوں کے کنول کھلے ہوتے۔ جن کا پہناوا بے شک سفید یونیفارم ہوتا پر کپڑے اپنی اعلیٰ کوالٹی کا پتہ بُہت دُور سے دیتے۔ اِس پر طرہ مال اور گلبرگ کے درزیوں کی کاریگری جن کی ماہرانہ کانٹ چھانٹ کپڑوں میں جان ڈال دیتی یوں کہ وہ اپنے آپ سے بولنے لگتے۔

وہ جو انجمن کے سیکنڈری اسکول میں آندھی کی طرح اُٹھی اور طوفان کی طرح چھا گئی تھی۔ اِس چوٹی کے کالج میں آکر صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔

وہ یہاں ایک امتیاز کے ساتھ آئی تھی۔ صوبے بھر کے درجہ اول اور درجہ چہارم اسکولوں کے لڑکے لڑکیوں کو ایس۔ ایس۔ سی کے امتحان میں مات دے کر اوّل آنے کا اعزاز جیتے ہوئے۔

اِس کالج کا انتخاب اُس کے بہن بھائیوں کی مشترکہ رائے سے ہوا تھا۔ جب پہلی بار وہ اپنی بڑی بہن جو خود میڈیکل کی سٹوڈنٹ تھی کے ساتھ یہاں آئی تو اُس نے ہر شے کو تعجب اور دلچسپی سے دیکھا۔ گیٹ سے باہر کی سڑک مختلف رنگوں کی کاروں سے اَٹی پڑی تھی۔ دروازے کھلتے اور نخروں کی پوٹلیوں میں لپٹی لڑکیاں نکلتیں۔ کچھ تو واقعی حسین تھیں، کچھ کو لیپا پوتی نے حسین بنا رکھا تھا۔ خوش رنگ، جدید وضع کے ملبوسات اور اُن سے اُٹھتی مختلف پرفیومز کی بھینی بھینی خوشبو اور اُن کے کھنکتے ہوئے مُسرور قہقہے اُسے بے چین کرنے کے لئے

کافی تھے۔

اُس نے اپنے آپ کو دیکھا تھا۔گھٹیا سی کاٹن کا لباس جس کی تراش خراش بھی بھدّی اور بدنما تھی۔اِس لئے کہ کپڑوں کے ذریعے جسمانی اعضاء کی نمائش کو اُس کے گھر میں سخت ناپسند کیا جاتا تھا۔

گزشتہ ایک ہفتے سے وہ جان کنی کے عذاب میں مبتلا تھی۔کالج کے انتخاب کا مسلہ جونہی حل ہوا اُس نے جستی ٹین کے صندوق سے اُن تینوں جوڑوں کو نکال کر اپنے سامنے رکھ لیا جو بار ہا پہنے اور دھوئے جا چکے تھے جن کے رنگ و رُوپ کوٹھے پر بیٹھی اُدھیڑ عمر کی نائکہ جیسی صورت اختیار کر گئے تھے۔

ایک ایک جوڑے کو اُلٹتی پلٹتی ۔تنقید کی کسوٹی پر پرکھتی اور پھر لہجے میں زمانے بھر کا دُکھ اُنڈیل کر اپنے آپ سے کہتی۔

''یا اللہ آخر ہم اتنے غریب کیوں ہیں؟''

اماں سے کچھ کہنا گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا تھا۔لیکن جب مسئلے کا کوئی حل نظر نہ آیا۔تب اُس نے سبزی چھیلتی اماں کے گھٹنے پکڑ لئے۔

اور اماں نے نہایت بے رحمی اور سنگ دلی کی چھری اُس کی گردن پر چلا دی یہ کہتے ہوئے۔

''لو ابھی تو چھ ماہ بھی نہیں گزرے تمہیں لیڈی ہملٹن کا سوٹ بنا کر دیا تھا۔زبیدہ کی شادی پر بنایا ہوا وہ مورا کین کا جوڑا کیا ہوا؟ ہاں تمہارے پاس وہ کپڑے بھی تو ہیں جو تمہاری چھوٹی پھوپھی نے دیئے تھے۔اُس کا جی چاہا اماں کے ہاتھ سے چھری چھین کر اماں کو ذبح کر ڈالے یا پھر اپنی تِکا بوٹی کرے۔

اماں کے بات کرنے کا انداز بھی کسی ظالم مارشل جیسا تھا۔چھوٹی پھوپھو کا دیا ہوا

سوٹ، زبیدہ آپا کی شادی پر بنایا ہوا سوٹ سب اماں کو یاد تھے۔شاید یہ یاد نہیں تھا کہ یہ کپڑے پھوپھو کی اُترن تھے جنہیں اُنہیں نے کمال شفقت سے اُسے عنایت کئے تھے۔

پھر اُس کا گلا روندھ گیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''اماں وہ سب تو پرانے اور بدرنگے ہیں۔''

''اچھا چل ہٹ میری جان نہ کھا۔سوچوں گی۔''

اور اُٹھتے بیٹھتے جب نئے سوٹ کا وِرد اُس کی زبان سے ہونے لگا تب اماں کو اُسے کپڑے بنا دینے میں ہی اپنی عافیت نظر آئی۔

جوڑا تو بلاشبہ نیا تھا پر سیا اُس کی بہن نے۔جس نے ستیاناس کر دیا۔ذرا فٹنگ نہیں تھی۔اُس نے کہا بھی۔

''آپا آپ نے تو اُسے جھولا بنا دیا ہے۔''

اور وہ نیک پروین محبت سے اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''بس ٹھیک ہے۔تنگ کروں گی تو خالہ اور نانی باتیں بنائیں گی۔''

"تو بنانے دو اُنہیں۔اب اُن کے ڈر سے ہم اپنی مرضی کا کوئی کپڑا بھی نہ پہنیں۔"

اُس کی بہن فارم داخلہ جمع کروا کر باہر آئی تو اُس نے اُس کا ناقدانہ جائزہ لیا۔وہ بھی ڈھیلے ڈھالے اُس جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ہمیشہ کی طرح اُس وقت بھی اُسے اُس پر سخت غصہ آیا۔

''یہ کم بخت بھی بُدھو ہے۔ذرا نفاست محسوس نہیں کرتی۔اب اگر یہ بونگی بنی رہے گی تو ہم اپنا حلیہ کیسے ٹھیک رکھ سکتے ہیں۔''

تب درختوں کے جُھنڈ تلے کھڑے ہو کر اُس نے اپنے دل میں دو فیصلے کئے۔

ایک یہ کہ وہ بہترین اوراچھا لباس پہنے گی اور کسی پر اپنی غُربت ظاہر نہ ہونے دی گی۔دوسرے وہ اپنے تعلیمی معیار کو اُونچا رکھے گی۔

پر ہوا یہ کہ ایک وعدہ تو اُس نے بلاشبہ پورا کیا۔کالج میں وہ بہت صاف ستھری حالت میں آتی تھی۔لڑ جھگڑ کر اُس نے عمدہ اور بہترین کپڑے کے دو جوڑے درزی سے سلوائے۔انہیں وہ جس طرح استعمال کرتی وہ دیکھنے والوں کو اُس کے پتلے گھریلو حالات کا پتہ دیتے۔آندھی اُٹھے،طوفان آئے،بارش برسے یا کوئی اورارضی یا سماوی آفت کاروبار زندگی کو معطل کردے۔وہ کپڑوں اور جُوتوں کی طرف سے غفلت نہیں کرتی تھی۔

کپڑوں کو ہر تیسرے دن دھوتی،کلف لگاتی،کوئلوں کی استری سے گھنٹہ بھر اُلجھتی اور جب وہ پسینہ پسینہ ہوکر اُٹھتی تو اُس کے بازوؤں میں پڑے دو جوڑے یُوں چمکتے جیسے کسی اُونچے درجے کی لانڈری سے دُھل کر آئے ہوں۔کچھ ایسا ہی حال جوتوں کے ساتھ تھا۔آدھ گھنٹہ تو انہیں چمکانے میں ضرور صَرف ہوتا۔جب وہ اتنے چمک جاتے کہ بقول اُس کے کوئی اگر منہ دیکھنا چاہے تو دیکھ سکتا۔تب اُس کے ہاتھ بُرش کی جان چھوڑتے۔

اماں کو اُس کے کپڑوں اور جُوتوں سے اِس درجہ انہماک کو دیکھ کر اختلاج قلب ہونے لگتا۔وہ غصے سے کہتیں۔

''اے میں کہوں تُو وہاں پڑھنے جاتی ہے یا کپڑے دکھانے۔جب دیکھو دُھلائی جب دیکھو اِستری۔''

اماں کی یہ بات اُس کے تن بدن کو سُلگا دیتی۔وہ بہتیرا چاہتی کہ خود ہی سُلگے اور حرارت اماں تک نہ پہنچے۔لیکن جانے کیا ہوتا۔وہ پھٹے ڈھول کی طرح پھٹ پڑتی۔

''تم تو چاہتی ہو من من بھر میل کپڑوں میں پھنسی رہے۔چیتھڑے لٹکے رہیں اور لوگ ہم پر ترس کھاتے رہیں۔اماں تمہارا صابن خرچ ہوتا ہے اِس لئے تم اتنا واویلا کرتی

ہو۔''

اور اماں بھنّا اُٹھتیں۔ اُس کا اتنا بے باک اور گستاخ لہجہ اُنہیں تلملا کر رکھ دیتا۔

''تم کوئی نئی کالج میں پڑھنے لگی ہو۔ میرے اور بھی بچے ہیں۔۔۔ ماشاءاللہ سارے ہی چوٹی کے کالجوں میں جاتے ہیں۔ پر جتنے پر پُرزے تم نے نکالے ہیں اِس لحاظ سے تو وہ شاباش کے مستحق ہیں۔''

''اماں تم ہزار بار بھی اُن پر داد و تحسین کے ڈونگرے برساؤ تب بھی مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ وہ اگر پاگلوں کی طرح اُٹھ کر چلے جاتے ہیں تو کوئی ضروری ہے میں بھی ویسے ہی جاؤں۔''

بڑبڑاتی ہوئی وہ کمرے سے نکل جاتی۔

اماں غصّے سے لال پیلی ہوتیں۔ طیش میں پُھنکارتیں۔ جی چاہتا دوری والے ڈنڈے سے اُس کی دُھواں دھار مرمت کردیں۔ پر گھر کی عورتوں سے ڈرتی تھی پھر ایسی مُنہ زور منہ پھٹ اولاد کیا بعید کہ ہاتھ ہی پکڑ لے۔

دو تین بار اُنہوں نے اُس کی بڑی بہن تہمینہ سے بھی بات کی۔

اُس نے اماں کی شکایات کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سُنا اور رسان سے کہا۔

''اماں چھوٹی چھوٹی باتوں پر مت کڑھا کریں۔ بہن بھائی ایک جیسے نہیں ہوتے ہر ایک کا اپنا اپنا مزاج ہے۔ اُسے اگر اچھے کپڑے پہننے کا شوق ہے تو کوئی ہرج نہیں۔ باقی اُس کا وقت ضائع ہوتا ہے یہ آپ کا مسئلہ تھوڑی ہے۔ وہ جانے اور اُس کا وقت۔''

اماں اب اُسے نالائقی کا طعنہ بھی نہیں دے سکتی تھیں۔ اُس نے اوّل آ کر سارے گلے شکوے دُور کر دیئے تھے۔

اور اعلیٰ درجے کے لانڈری ہاؤس سے دُھل کر آنے والے کپڑوں کی حفاظت

کے لئے وہ کیا کیا جتن کرتی اُس کا اندازہ صرف اُسی کو تھا۔ کالج اور اُس کے گھر کا درمیانی فاصلہ آٹھ نو میل تھا۔ پہلا پیریڈ شروع ہونے سے کوئی دو گھنٹے قبل ہی وہ گھر سے نکل پڑتی۔ بسوں میں اُترتے اور چڑھتے اُسے نہ تو اپنی کتابوں کا فکر ہوتا اور نہ اپنی جان کا۔ آگے پیچھے دائیں بائیں غرضیکہ ہر سمت اُس کی نظریں اپنے کپڑوں پر ہوتیں۔ کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں اور بڑی بڑی گٹھڑیاں اُٹھائے دیہاتی عورتیں بھی بس میں سوار ہوتیں۔ اُن کی پکڑ دھکڑ اور کھینچا تانی کے شور شرابے میں اُس کا جی چاہتا کہ وہ اُنہیں اُٹھا کر کھڑکیوں کے راستے سڑک پر پھینک دے۔ ایسے دنوں میں شامت اعمال سے اگر اُس کے کپڑوں کی کریز خراب ہو جاتی، دوپٹے میں شکنیں پڑ جاتیں، جُوتے کا چہرہ گنوار عورتوں کے پاؤں کی دُھول مٹی سے دُھندلا جاتا۔

تب دو خواہشیں اُس کے دل میں پھڑکنے لگتیں۔ پہلی زیادہ طاقتور ہوتی کہ چلتی بس سے چھلانگ مار کر اپنا قصہ ہی پار کر لے یا پھر اندھی عورت یا مرد کا گلا گھونٹ دے جس کا پاؤں اُس کے جُوتے پر آیا تھا۔

کالج گیٹ پر رنگ برنگی کاروں سے جب وہ لڑکیوں کو اُترتے ہوئے دیکھتی تو اور بھی جل جاتی۔ کڑھ کر خود سے کہتی۔

''ارے اِنہوں نے ایسی کون سی نیکیاں کی ہیں جو اللہ کو اتنی پسند آئی ہیں کہ دولت کی بارش میں نہاتی اور مزے لوٹتی ہیں اور ہم جیسوں نے کیا گناہ کئے ہیں کہ پیسے پیسے کو ترسنا مقدر بن گیا ہے۔ اللہ کس شان اور طمطراق سے کاروں میں بیٹھتی ہیں۔ ہمارے نصیبوں میں تو بسوں اور سڑکوں پر دھکے کھانا لکھا گیا ہے۔''

درختوں کے جھنڈ تلے کھڑے ہو کر اُس نے جو دو وعدے اپنے آپ سے کئے تھے اُن میں سے ایک تو اُس نے جی جان سے نبھایا پر دوسرا وعدہ وہ پورا نہ کر سکی۔

وجوہات بھی کافی تھیں۔

ایک تو وہ ایکا ایکی اُردو میڈیم سے انگلش میڈیم میں آ گئی تھی۔ کونونٹ اور دوسرے انگریزی اسکولوں کی لڑکیاں جب فرّاٹے کی انگریزی بولتیں تو وہ بس دیکھتی رہ جاتی۔ عجیب سی پژمردگی اوراحساس کمتری کا احساس اُس کی آنکھوں اور چہرے پر پھیل جاتا۔

دوسرے پڑھائی سے اُس کی وابستگی بھی کم ہوگئی تھی۔ خوش پوش امیر زادیاں اور خوبصورت لیکچرارز اُس کے حواسوں پر ہمہ وقت مسلط رہنے لگی تھیں۔ وقت کا بیشتر حصہ جلنے، کڑھنے اور ڈینگیں مارنے میں گزرنے لگا۔ میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں میں پڑھنے والے اُس کے بہن بھائی بلاشبہ اُس کے لئے امتیاز کا باعث بن رہے تھے۔ ماموں بڑے افسر تھے ہی۔ سادہ لوح چچاؤں کو بھی اُس نے اعلیٰ درجے کے افسر بنا ڈالا۔ رہا باپ تو وہ بھی اُس کی زبان کی ہلکی سی جنبش سے فوج میں افسری کی اُونچی کُرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ جس ڈگر پر جارہی تھی اُس کا شدید احساس اُسے اُس وقت ہوا جب سال اوّل کے نتیجے کی سلپ اُسے ملی وہ جو پورے ضلع میں اوّل آئی تھی پاس تو بے شک ہوگئی تھی۔ اگلی جماعت میں ترقی بھی مل گئی تھی، پر کیسے جیسے چھوٹا بچہ ایڑیاں گھٹنے رگڑ رگڑ کر سیڑھیوں کا پہلا پوڈا چڑھے۔

اُس نے رزلٹ کارڈ کو آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے دیکھا اور گھاس پر یوں بیٹھی جیسے میلوں کی مسافت نے تھکا ڈالا ہو۔ حقیقتاً اُس نے سفر بھی تھکا دینے والا کیا تھا۔ گزشتہ ایک سال پر محیط اپنے آپ سے لڑتے، جنگ کرتے، اضطراب اور پریشانیوں کی سُولی پر چڑھتے۔ آخر اِن سب کا نتیجہ تو نکلنا تھا اور وہ نکلا۔ دل اندر اور باہر ہوتا رہا۔ آنکھیں بھیگتی اور خشک ہوتی رہیں۔ چہرے پر کبھی یاس اور کبھی اُمیدوں کے سائے لہراتے بل

کھاتے رہے۔

اور درختوں کے سائے لمبے ہوتے گئے۔

تب وہ اُٹھی آنسوؤں کو ہاتھوں کی نرم و نازک پوروں سے صاف کیا اور گھر چل دی۔ پہلی مرتبہ فوراً کھانے سے فارغ ہو کر وہ کتابیں لے کر بیٹھی اور رات کے دو بجے تک پڑھتی رہی۔

اور پھر وہ آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھتی گئی اُوپر اور اُوپر۔ ساتھی لڑکیوں کو حیران کرتی اور پھر ایک دن پہلے کی طرح اُس کا نام نوٹس بورڈ پر سرِ فہرست تھا۔

جو اسٹینڈرڈ اور معیار وہ اپنی کوشش اور جدّ و جہد سے حاصل کر سکتی تھی وہ جلد یا بدیر اُس نے اپنی لگن، ہمت اور کوشش کے بل بوتے پر حاصل کر لیا۔ پر دیگر معاملات میں وہ کوری رہی۔ گھر پرانی معاشرتی قدروں کو سینے سے لگائے اُن کی حفاظت کا داعی بنا بیٹھا تھا۔

فلم اُس نے کبھی دیکھی نہ تھی۔ تنگ نظری کا وہ عالم کہ فلم دیکھنا گویا گناہ کبیرہ تھا۔ اخبارات کے فلمی اشتہاروں والے صفحات پر نظریں دوڑانا معیوب تھا۔ ایسے میں اُن کے متعلق اُس کی معلومات بھی صفر تھیں۔ لڑکیاں جب اُونچے اُونچے فلمی کرداروں پر بحث کرتیں تو وہ چپ چاپ بیٹھی اُن کی گفتگو سنتی رہتی۔ یا اُنکے منہ تکتی۔

لاہور سے باہر کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ددھیال باڈر کے قریب ایک گاؤں میں ڈیرے ڈالے بیٹھی تھی۔ بس کبھی کبھی وہاں جانا ہوتا۔ گاؤں کا ماحول کچے گھر اور کھیت کھلیان، وہاں کائنات ہی مختصر تھی۔ کوئی اُن پر کتنا بول سکتا تھا۔

اب جب مری، ایبٹ آباد، سوات، کاغان اور ناران کے دلکش اور دلفریب نظاروں پر زور شور سے باتیں ہو رہی ہوں۔ انگلینڈ، امریکہ اور یورپین ممالک کے تذکرے ہوں۔ گرمیوں میں وہاں جانے اور رہنے کے پروگرام ہوں تو ظاہر ہے وہ ٹک ٹک دیدم و دم

نہ کشیدم کے مصداق محض تماشائی ہی بن سکتی تھی یا پھر اپنے آپ اور اپنے گھر گھرانے پر کڑھ سکتی تھی جو وہ کڑھتی تھی جز بز ہوتی تھی۔

ایک دن اُس کی ایک دوست فرخ ہنستے ہوئے اُس کے شانوں پر دو ہتڑ جما کر بولی۔

''یا اللہ تم کنوئیں کی مینڈک ہو۔ کتابی کیڑا ہو۔ بتاؤنہ آخر تم اتنی ان سوشل کیوں ہو؟''

اُسے اپنے بہن بھائیوں پر بھی شدید غصہ آتا۔ کم بخت سب کے سب اوندھے ایک سے ایک بڑھ کر کتابی کیڑے۔

چند اُونچے گھروں کی لڑکیوں نے اُس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا بھی پر اُس نے کسی گرم جوشی کا ثبوت نہ دیا۔

اور دیتی بھی تو کیسے ڈینگیں تو بے انتہا مار رکھی تھیں۔ کل کلاں جو اُس کے گھر آ ٹپکتیں اور ساری قلعی کھل جاتی تو کس قدر سبکی والی بات ہوتی۔

اور جب وہ بی۔ ایس۔ سی سے فارغ ہوئی تب تک اُس کے دو بھائی اور بہن یورپ سُدھار چکے تھے۔ سب سے بڑا بھائی کولمبو پلان کے تحت کینیڈا انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے چلا گیا۔ برٹش کونسل کی طرف سے اُس کی بہن کو وظیفہ مل گیا اور وہ سرجری میں سپیشلائزیشن کے لئے لندن روانہ ہوگئی۔ تیسرے نمبر والا بھائی اورگینک کیمسٹری Organic Chemistry میں ڈاکٹریٹ کے لئے امریکہ چلا گیا۔

اور پھر یوں ہوا کہ وہ لڑکی جو خود کو کنوئیں کا مینڈک سمجھتی تھی۔ ایکسچینج پروگرام کے تحت ڈھاکہ یونیورسٹی کے لئے منتخب ہوگئی۔

ایک بارش برساتی دوپہر کو پی۔ آئی۔ اے کے سبز اور سفید ٹرائی ڈنٹ میں بیٹھی

اُس سرزمین کی طرف روانہ ہوئی جس کے باسیوں کو مشرق کے اطالوی کہا جاتا ہے۔

باب نمبر۹:

یہ پابندیوں اور روک ٹوک سے آزاد ایک خودمختار سی زندگی تھی جو ماضی میں بہر حال اُسے حاصل نہ تھی ۔ وہ خواہشیں اور آرزوئیں جو ہمیشہ سینے میں مچلتی رہتی تھیں ۔ اُنہیں وہ اِس اجنبی سرزمین پر بُہت شان سے پُورا کر رہی تھی ۔شانوں پر لہراتے بل کھاتے بال جن کی چمک اور کھلا رآنکھوں کو بھلا لگتا تھا، اُسے بُہت پسند تھے ۔اکثر وہ اپنی موٹی سی لمبی چوٹی کو اُنگلیوں کی پوروں سے مسلتی اور اپنے آپ سے کہتی تھی ۔

''اللہ میرا بس چلے تو بالوں کے اِس جنگل کو پلک جھپکتے میں کٹوا دوں میرے گھنے بال میرے کندھوں پر بکھرے ہوئے کتنے خوبصورت لگیں گے ۔''

جدید کپڑوں پر دوپٹہ گلے میں ڈالنا بُہت مرغُوب تھا ۔لیکن موٹا دوپٹہ اوڑھے بغیر گھر سے قدم نکالنا دُشوار تھا ۔یہ اور بات ہے کہ ایک چھوٹا سا دوپٹہ وہ کتابوں میں رکھ کر اپنے ساتھ کالج ضرور لے آتی ۔لباس سے اُٹھتی بھینی بھینی خوشبو اور ہلکے ہلکے میک اَپ کی اُسے شدید تمنا رہتی تھی ۔ پر اِس تمنا کا اظہار اُس دقیانوسی اور روایات کی سٹرانڈ مارتے گھر میں ممکن نہ تھا ۔اکثر و بیشتر جب وہ لڑکیوں اور عورتوں کو چھوٹا سا دوپٹہ گلے میں ڈالے مکمل اعتماد اور وقار سے سُبک تلے قدم اُٹھاتے دیکھتی تو اپنے آپ سے یہ ضرور کہتی ۔

''کس قدر فضول اور احمقانہ بات ہے کہ عورتیں اگر اپنے سر کُھلے رکھیں تو فرشتے اُن پر لعنت بھیجتے ہیں لو بھلا اللہ کی یہ نیک مخلوق لعن طعن کرنے اور اچھے بھلے انسانوں پر پھٹکار ڈالنے کے لئے ہی تو رہ گئی ہے اور تو کوئی کام ہی نہیں ہے اِنہیں ۔''

پھر لہجے میں تھوڑی سی ملامت کا عنصر عود آتا ۔

"واہ لوگوں نے بھی اپنی مطلب برآری کے لئے کیسی کیسی تاویلیں گھڑ رکھی رہیں؟

ایک وہ ہماری ماں جی ہیں کیسی احمقانہ باتیں کرتی ہیں؟ نا قابل یقین ۔پڑھے لکھے لوگوں کی ذ ہنی گرفت میں نہ آنے والی ۔دو چوٹیوں والی عورت کی قبر میں سے قیامت کے روز دو سانپ اُس کے سرہانے سے نکلیں گے۔کمال ہے گویا احتساب کا عمل اعمال پر نہیں چوٹیوں پر ہوگا۔''

کبھی کبھی ماں جی عورتوں کی بڑھتی ہوئی آزادی پر اپنا تقریری سلسلہ شروع کرتیں اور اپنے بیان میں یہ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتیں کہ ننگے سر گھومنے پھرنے والی عورتوں کے چہروں سے نحوست ٹپکتی ہے۔

تب اُس کا جی چاہتا کہ وہ اُونچے اُونچے چلا کر کہے۔

''غلط بات! کہاں ٹپکتی ہے نحوست؟ میں تو ہر وقت دیکھتی ہوں ایسے ملیح چہرے سمارٹ تازہ دم خوبصورت وجود اور حسین شکلیں۔جن کے نقش ونگار کا مول نہیں۔جن کی ملاحت اور رعنائیوں کا جواب نہیں۔

پھر ایک خاموش آواز تلخی سے بھری ہوئی اندر سے اٹھتی ۔ایک ہم جیسے بھی ہیں جو موٹے ڈوپٹے گیان دھیان سے اوڑھتے ہیں۔اپنا آپ چھپا کر رکھتے ہیں پر چہرے ہیں کہ نہ اُن پر رونق ہے اور نہ تازگی۔''

اور جب وہ ڈھاکہ جانے کے لئے تیار ہوگئی۔اُس کا اٹیچی نئے اور خوش رنگ کپڑوں سے بھر گیا۔استعمال اور ضرورت کی ہر شے اُس نے اچھی اور عمدہ خریدلی۔جوتیوں کے کئی جوڑے بھی بیگ میں ٹھونس لئے ۔دن وقت اور تاریخ کا تعین بھی ہوگیا اور جہاز میں پرواز کا ٹکٹ بھی اُسے مل گیا۔

تب اُس نے ایک خوفناک فیصلہ کرڈالا۔

وہ شانوں پر ہلکورے کھاتے بالوں کے ساتھ ڈھاکہ ایئر پورٹ پر اُترے گی۔

یہ خوفناک خیال جب پہلی مرتبہ اُس کے دماغ میں آیا تو وہ ساری جان سے ایک پل کے لئے لرزی تھی۔ کسی نے دیکھ لیا۔ کسی کو پتہ چل گیا؟ تب باتوں کی توپوں کے منہ کھُل جائیں گے اور اُس کا تیا پانچہ ہو جائے گا۔

جب ذرا خوف و ہراس کی فضا سے باہر نکل کر حالات کا جائزہ لیا۔ راز کو راز رہنے کے امکانات کو کسوٹی پر پرکھا تب یہ کام اتنا کٹھن نظر نہ آیا۔

ہاں ڈھاکہ جا کر بالوں کو سیٹ کروانے کی بھی ایک تجویز ذہن میں پیدا ہوئی پر اِس تجویز سے وابستہ کچھ خدشات بھی اُبھر کر سامنے آئے جن پر غور کرتے ہوئے اُس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''نہیں یہ مناسب نہیں رہے گا۔''

اور پھر جس روز اُسے سفر کرنا تھا۔ اُس صبح وہ ایک دوست کی مدد سے اپنے اچھے خاصے لمبے بال تھوڑے سے کٹوا آئی۔ چوٹی موٹے جارجٹ کے ڈوپٹے میں چھپ گئی تھی۔

طیارے میں بیٹھ کر موٹی سی چوٹی کو اُس نے ہاتھوں سے چھوا۔ شانتی اور سُکھ سے لبالب بھرا سانس لیا۔ تین چار گھنٹوں نے اُسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ افشائے راز کا خوف اُس سے اُلٹی پلٹی حرکتیں کروانے لگا تھا۔ وہ اپنی سیدھی سادی اور بڑبولی ماں سے تو ذرا بھی نہ ڈرتی تھی۔ خوف تھا تو رشتہ داروں کا جو بغیر بنیاد کے فضُول اور بے تکی باتوں کی عمارت آناً فاناً کھڑی کر دیتے تھے۔

باب نمبر ۱۰:

اُس وقت جب تیزی سے مغرب کو جاتے ہوئے سورج کی سُنہری کرنیں کنٹین کی دیواروں کے لمبے لمبے شیشوں کے دریچوں سے چھن چھن کر اندر قطار در قطار رکھے فارمیکا کی چکنی شفاف میزوں کی سطح پر بکھرتے ہوئے ایک بے نام سی اُداسی کا گہرا احساس پیدا کر رہی تھیں۔ وہ گرم گرم سنگھاڑے (سموسے) کھانے اور کنٹین کے نئے ملازم لڑکے سے باتیں کرنے میں منہمک تھی۔ یہ کمزور سا لڑکا جس کے موٹے موٹے نقوش یہ بتاتے تھے کہ اگر وہ صحت مند ہوتا تو یقیناً وجیہہ لوگوں میں شمار ہو سکتا تھا۔ اِس وقت اُسے اپنی غربت کی داستان سُنا رہا تھا۔ وہ داستان جو تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ اُس کی اپنی داستان تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اُس نے محبت سے اُس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ کر شفقت گھلی آواز میں اُسے کہا تھا۔

''دیکھو حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا سیکھو۔ جب جدوجہد تعمیری انداز میں آگے بڑھے گی تو تبدیلی ضرور پیدا ہوگی۔''

وہ شیخ مجیب الرحمٰن کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہوئے اب اُس کے چھ نکات پر تفصیلی بحث کرنے لگا تھا۔

تبھی ایک اجنبی چہرے نے اُس کے بالکل قریب آ کر کہا کہ اگر وہ ویسٹ پاکستانی ہے اور اُس کا نام نجمہ شمشیر علی ہے تو گیٹ پر صبیحہ نامی ایک خاتون اُس کا انتظار کر رہی ہے۔

اُس نے پیغام دینے والی اُس لڑکی کو دیکھا جس نے سکرٹ کے نیچے اُونچی ہیل کے سلیپر پہن رکھے تھے۔ وہ بنگالی نہیں تھی اُس کی انگریزی شستہ اور خاصی رواں تھی۔

لب ولہجہ اور نقش ونگار افریقہ کے جنوبی علاقوں جیسے تھے۔شاید یہی وہ لڑکی تھی جس کے بارے میں دودن پہلے باتیں ہورہی تھیں جو تنزانیہ سے آئی تھی۔

اُس وقت گرم چائے کا کپ اُس نے اُٹھا کرلبوں سے لگایا تھا چند گھونٹ بھرے تھے اوراب وہ سوچتی تھی کہ چائے اُدھوری چھوڑ کر باہر کی طرح بھاگے یا اُس لذیذ چائے کو پُوری پی کر جائے۔اُس نے دونوں کے بین بین کام کیااور آدھا کپ چائے کا میز پر رکھ کر تیزی سے مشرقی دروازے سے نکل گئی۔آدھے راستے میں جا کر یاد آیا کہ نہ تو پیسوں کا حساب کیااور نہ ہی ادائیگی کی۔ پیسے تو ہاتھ میں ہی پکڑے رہ گئے۔جی میں آیا کہ واپس جائے پر پھر یہ کہتے ہوئے کہ ابھی واپس آکرادائیگی کرتی ہوں۔قدم گیٹ کی طرف اُٹھا دیئے۔

صبیحہ مقامی تا ناش گیس کمپنی میں ملازم تھی۔گزشتہ دنوں اُس سے ڈھاکہ ٹی وی اسٹیشن کے اڈیشن رُوم میں ملاقات ہوئی تھی جب وہ یونیورسٹی میگزین پروگرام کے سلسلے میں وہاں گئی تھی۔چھبیس 26 ستائیس 27 کے ہیر پھیر میں یہ عورت نما لڑکی خاصی ملنسار تھی۔جب اُس کا ٹی وی اسٹیشن جانا ختم ہوگیا تب بھی وہ کبھی کبھی اُس سے ملنے ہال چلی آتی۔

اُس کی دوسری ٹرم ختم ہونے کو تھی جب ایک دن اُس کی ساتھی لڑکیاں چٹا گانگ اور کاکس بازار کا پروگرام بنا بیٹھیں۔نائیلہ نے ساڑھی کا آنچل دُرست کرتے اور کتابیں اُٹھا کر کلاس روم کی طرف بڑھتے بڑھتے رُک کر کہا۔

''بھئی ملک کی سیاسی فضا خاصی کشیدہ ہے تنہا چار پانچ لڑکیوں کا ٹرپ پر جانا کچھ ٹھیک نہیں۔کسی قابلِ اعتماد آدمی کو ساتھ لو۔''

باقی لڑکیوں نے بھی نائیلہ کی اِس بات سے اتفاق کیا۔ایک دن جب صبیحہ اُس سے ملنے یونیورسٹی آئی تو یونہی برسبیلِ تذکرہ اُس سے بھی بات ہوگئی۔صبیحہ نے اپنے چند ملنے

والوں کے حوالے دیئے کہ وہ اُن سے بات کرے گی کہ اگر اُن میں سے کسی کا آفس ٹور چٹا گانگ سائیڈ کا ہو تو وہ اُنہیں کمپنی دے دے۔ خرچہ پُول کرلیں گے۔ چلتے چلتے بھی اُس نے صبیحہ کو تاکید کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو اپنی مصروفیت میں اِس اہم کام کو بھولنا نہیں۔ ہمارے لئے موسم اور وقت دونوں ہی بہترین ہیں۔ تھرڈ ٹرم شروع ہونے پر پھر سر اُٹھانا مشکل ہو جائے گا۔''

اور صبیحہ نے جواباً کہا تھا۔

''بھئی مجھے خود احساس ہے کہ یہاں کی خوبصورت اور قابلِ دید جگہیں تم دیکھ لو۔ بار بار کوئی آیا جاتا ہے اور پھر سیاسی حالات جس نہج پر جا رہے ہیں کوئی نہیں جانتا کہ کب بوریا بستر گول کرنا پڑ جائے۔''

لمبے چوڑے آڈیٹوریم کو تیزی سے پار کرتے کرتے وہ اپنے آپ سے بولی تھی۔

''یقیناً صبیحہ نے کسی سے بات کی ہوگی اور اب اُسے اطلاع دینے آئی ہے۔''

آہنی گیٹ کی چھوٹی کھڑکی میں سے جھک کر وہ باہر نکلی نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں۔ پبلک لائبریری کی دیوار کے پاس ڈاٹسن میں بیٹھی صبیحہ ہاتھ ہلا رہی تھی۔ دائیں بائیں دیکھے بغیر اُس نے بھاگ کر سڑک پار کی۔ وہ اُس وقت سفید نیل باٹم چیک شرٹ اور اس پر سیاہ چنا ہوا ڈوپٹہ پہنے ہوئے تھی۔ گھنے سُرخی مائل بال اُس کے کندھوں پر لہراتے بل کھاتے بہت خوبصورت نظر آتے تھے۔ اُس کے دلکش نقش و نگار، اندرونی سکون، اور بے فکری نے چنبیلی کے پُھولوں جیسی رنگت والے چہرے کو رعنائی بخشی ہوئی تھی۔ خوشنما لباس اور انداز و اطوار نے اُس کی شخصیت کو من موہنا سا بنا رکھا تھا۔

اُس کا اندازہ درست نکلا۔ صبیحہ حقیقتاً اُس سے چٹا گانگ کے پروگرام کی تفصیل جاننے آئی تھی وہ اُس سے اِسی بابت باتیں کرنے لگی۔ اور کار میں بیٹھے کسی دوسرے شخص کا

نوٹس نہیں لے سکی تھی ۔ پر دفعتاً جب اُس کی نظر ڈرائیونگ سیٹ پر پڑی اُس نے دیکھا تھا اسٹیرنگ کو بازوؤں کے ہالے میں لئے سیاہ گھنے بالوں اور خوبصورت آنکھوں والا مرد اُسے بغور دیکھ رہا تھا۔

اُس کے چہرے کا رنگ بدلا اور جو بات وہ کر رہی تھی وہ بیچ میں ہی چھوٹ گئی ۔

فوراً پچھلی سیٹ کا دروازہ کھلا ۔ بھاری اور رُعب دار آواز میں اُسے بیٹھنے کے لئے کہا گیا ۔ وہ تھوڑا سا جھجھکی ۔ صبیحہ نے اُسے محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹھو پروگرام سڑک پر کھڑے کھڑے تو طے نہیں ہو گا۔''

اب حیل و حجت کرنے کا موقع نہیں تھا ۔ وہ بیٹھ گئی ۔ گاڑی نے خفیف سا جھٹکا کھایا اور چل پڑی ۔ نیل کھیت کی سڑکوں کے موڑ تیزی سے کٹ رہے تھے ۔ وہ بالکل خاموش بیٹھی تھی ۔

اور جب سیکنڈ کیپٹل کی ارغوانی عمارات نظر آنے لگیں ۔ اُس سے پوچھا گیا کہ چٹا گانگ جانے والی لڑکیاں تعداد میں کتنی ہیں؟

اُس کا لہجہ بڑا مدھم تھا جب وہ بولی ۔

''اُس سمیت چار۔''

''کوئی بنگالی بھی ہے؟'' ایک بار پھر پوچھا گیا ۔

''نہیں ۔ دو پنجابی ہیں اور دو آغا خانی ۔''

''خیال رکھیں کہ آپ کے ساتھ کوئی بنگالی لڑکی نہیں ہونی چاہیئے ۔''

''اِس کا مطلب ۔''

اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا ۔ خوف کی ایک ٹھنڈی لہر سر سے لے کر پاؤں تک اُترتی ہوئی محسوس ہوئی تھی ۔ شاید اُس لئے کہ ابھی چند لمحے قبل صبیحہ نے اُس کا

تعارف کرواتے ہوئے جس خاندان سے اُس کے تعلق کو ظاہر کیا تھا اُس کے متعلق وہ سُن چکی تھی کہ وہ بنگال کا اُونچا اور معزز گھرانہ ہے اور خود وہ صوبائی حکومت میں اکیسویں گریڈ کا ایک اعلیٰ افسر۔

"باپ رے باپ۔اُس نے خود سے کہا۔پھر اپنے آپ سے پہلے بولی۔''کہیں یہ سیاحت کا شوق لے کر نہ بیٹھ جائے۔''

اُس نے سوچا اور پھر چاہا کہ وہ اپنے اِس خوف کا اظہار کسی نہ کسی انداز میں صبیحہ سے کر دے۔لیکن کیسے کرے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔پھر جانے وہ کس خیال اور سوچ کے تحت خاموش رہی۔پر اضطراب کے ہلکے ہلکے غبار میں ضرور لپٹی رہی۔چینگوا کے سامنے گاڑی رُکی۔اُس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا اور بولا۔

''آیئے ایک کپ چائے پی لیں۔''

چائے اور وہ بھی ہوٹل میں۔اُس کا تعلق سوسائٹی کی جس کلاس سے تھا وہ ہوٹلوں میں جانے اور وہاں کھانے پینے کو سخت معیوب خیال کرتی تھی۔

اُس نے صبیحہ کے شانے پر ہاتھ رکھا اور قدرے خوف زدہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور بکری کے بچے مانند ممنائی۔

''پلیز صبیحہ میں کبھی کسی ہوٹل میں نہیں گئی۔مجھے معاف کر دو۔''

''ارے مفت میں گھبرا رہی ہو۔یہ کوئی ایسے ویسے ہوٹل نہیں ہیں۔چلو آؤ۔''

اُس نے کار کا دروازہ کھولا اور باہر نکلتے ہوئے کہا۔

''اور وہ جو دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے کھڑا اِن دونوں کی گفتگو غور سے سن رہا تھا۔اب آگے بڑھا، اُس کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے بولا۔

''یہ اعلیٰ درجے کا ریستوران ہے۔تھرڈ کلاس ہوٹل نہیں۔گھبرائیں مت۔

آیئے۔''

وہ سخت شرمندہ ہوئی۔شرمندگی کا یہ عکس اُس کے چہرے پر بھی پھیل گیا اور یہی وجہ تھی کہ جب دروازہ کھولا گیا، وہ فوراً باہر نکلی۔اُس نے اُن کے ساتھ قدم اُٹھائے۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے قد آدم آئینوں میں اُسکی نظر اپنے سراپے پر پڑی۔ حیرت زدہ ہوکر اُس نے سوچا۔

''یہ میں ہوں۔ایسی شاندار اور گلیمرس لڑکی۔''

حقیقتاً اُسے اپنا آپ اجنبی محسوس ہوا تھا۔

اِردگرد کی بے شمار چیزیں اُس کے تعجب میں اضافہ کر رہی تھیں۔چپٹی ناکوں اور تکونی آنکھوں والے چینی دیکھ کر اُسے پاکستان اور چین کے تعلقات پر بہت سی باتیں یاد آئیں۔مسکراتے چہروں والے ویٹرز کو اُس نے دلچسپی سے دیکھا۔

چائے آئی۔صبیحہ نے بنانے کے لئے چائے دانی کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا جب وہ بولا۔

''ٹھہرو اُسے بنانے دو۔دیکھتے ہیں جتنی شاندار یہ خود ہیں چائے بھی ویسی ہی بناتی ہیں۔''

اور سچ تو یہ تھا کہ اُس کا سانس اُس وقت گلے میں اٹک گیا۔

''میں۔''

گھبرائے ہوئے لہجے میں جب اُس نے یہ کہا تو سُرخ کیوٹکس میں ڈوبے ناخنوں والا ہاتھ خودبخود اُس کے سینے پر آ گیا تھا۔

''ہاں ہاں آپ۔میں نے یہ بات خالصتاً آپ کے لئے کہی ہے ہال میں بیٹھے کسی دوسرے انسان کے لئے نہیں۔''

وہ جو دونوں بازو میز پر رکھے اپنے چوڑے شانوں کو قدرے آگے جھکائے اُسے نہایت دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اب کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ وہ خفیف سی ہوگئی۔ ہونٹوں کو مضبوطی سے بھینچتے ہوئے اُس نے ایک نظر گود میں پڑے اپنے دونوں ہاتھوں پر ڈالی اور دوسری میز پر رکھے برتنوں پر۔

سچی بات ہے سانپ کے منہ میں چھچھوندر والی بات ہوگئی کہ اُگلے بنے اور نہ نگلے۔

تب اُس نے چپکے سے اپنے آپ سے کہا۔

میں خود کو کبھی ان کلچرڈ نہیں کہلواؤں گی۔ اب یہ کس قدر سُبکی والی بات ہے کہ میں اگر یہ کہوں کہ مجھے چائے بنانے اور پیش کرنے کے ایٹی کیٹس کا علم نہیں۔ اب اس میں میرا بھی بھلا کیا قصور ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے گھروں میں کبھی ایسے چائے بنی ہی نہیں۔ ہم لوگ تو کھولتے پانی میں چینی پتی اور دودھ کبھی کچھ ڈال دیتے ہیں۔ جب تینوں چیزیں پکتے پکتے بے حال ہو جاتی ہیں تب دیگچی کو چولہے سے اُتار کر پیالیوں میں ڈالتے ہیں اور وہیں باورچی خانے میں بیٹھ کر سڑپ سڑپ کرتے ہوئے پی لیتے ہیں۔ کسی گھر میں جو بطور مہمان پی بھی تو مجھے یہ قطعی یاد نہیں کہ پہلے کون سی چیز کیوں میں ڈالی گئی۔

اور یہ شخص جو اِس خوبصورت ماحول میں بہت اُونچی شے لگ رہا ہے میرے بارے میں کیا سوچے گا کہ میں کتنے بیک ورڈ گھرانے سے ہوں۔

''سو میں چائے ہرگز نہیں بناؤں گی۔''

اُس کا اندر اُس کے چہرے پر رقم ہو رہا تھا اور وہ جہاں دیدہ شخصیت اُسے پڑھ رہی تھی۔

پھر اُس نے مسکراتے ہوئے برتن اپنی طرف کھینچے اور دھیمے سے بولا۔

''تو آپ چائے نہیں بنائیں گی۔''

اُس نے صبیحہ کو دیکھا اُس کی نظروں میں ایک التجا تھی۔

''بتایئے چینی کتنی؟''

دو خوبصورت کشش سے لبالب بھری آنکھیں اُسے تک رہی تھیں۔

''جتنی آپ کا جی چاہے۔'' اُس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے قدرے شوخی سے کہا۔

''بہت خوب۔''

اُس کا مُسکراتا چہرہ یہ بتاتا تھا کہ اُس نے اِس جواب کو پسند کیا ہے اور جب اُس نے دودھ دان اُٹھایا تو ایک بار پھر اُسے دیکھا اور اسی شگفتہ انداز میں بولا۔

''میرا خیال ہے دودھ بھی مجھے اپنی مرضی سے ڈالنا ہوگا۔''

''جی۔ہاں۔آخر آپ کی پسند کی چائے پینے میں حرج ہی کیا ہے؟''

اِس بار جواب صبیحہ نے دیا تھا۔

اور جب اُس نے کپ لبوں سے لگایا اُس سے پوچھا گیا کہ اُس کے والد کیا کام کرتے ہیں۔

''فوج میں میجر ہیں۔''

اُس نے اعتماد سے گردن اُوپر اُٹھائی اور جواب دیا۔

اور عین اُسی وقت ضمیر نے بھی لعن طعن کا سلسلہ شروع کر دیا۔

''کمال ہے۔اب بھلا میں اِس آدمی کو جو ایک بہت بڑا افسر ہے بتاتی ہوئی کیا اچھی لگوں گی کہ میرا باپ محض صوبیدار ہے۔ سچی بات کتنی ہلکی اور کم مایہ ہے۔اُس کا اظہار بندے کی بے وقعتی کو ظاہر کرتا ہے۔''

احساس کمتری کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُس نے بار بار یہ سوچا اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

اور پھر وہ پہلے کی طرح پچھلی سیٹ پر بیٹھی انہوں نے اگلی نشستیں سنبھالیں اور ڈائسن شبک خرامی سے چل پڑی۔

جناح ایونیو کے پاس گاڑی رُک گئی۔صبیحہ کا گھر یہاں سے نزدیک تھا۔اُس نے دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے اُسے خدا حافظ کہا۔

وہ ہٹپٹا اُٹھی۔گھبرائے ہوئے لہجے میں اُس سے صرف یہی کہا گیا۔

''آپ لوگ پہلے مجھے ڈراپ کر دیتے۔''

صبیحہ کے کچھ کہنے سے پیشتر ہی وہ بول اُٹھا۔

''آپ چاہتی ہیں میں پھیرے لگانے میں جُتا رہوں۔آپ کو ڈراپ کرنے کے بعد میرے لئے گھر جانا آسان ہوگا۔ہاں گھبرائیے نہیں میں سندر بن کا چیتا نہیں جو آپ کو چھاڑ کھاؤں گا اور آپ یقیناً محسوس نہیں کریں گی اگر میں آپ سے اگلی سیٹ پر بیٹھنے کے لئے کہوں۔اِس لئے کہ مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ لوگ مجھے آپ کا شوفر سمجھیں۔''

وہ خاموشی سے آگے آ کر بیٹھ گئی۔لیکن اُسے محسوس ہو گیا تھا کہ وہ بے چین بھی ہے اور خوف زدہ بھی۔

لڑکی بڑی معصوم اور بھولی بھالی سی ہے۔

تب نرم اور شفیق لہجے میں اُس نے اُس کے ساتھ باتیں کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔اُس کے بہن بھائیوں کی تعداد۔وہ کیا کرتے ہیں اور کہاں کہاں مقیم ہیں؟ مُلکی حالات، پُوربو پاکستان کے مسائل اور اُسکے خیال میں اُن کا حل۔اُس نے اِن سبھوں پر اُسے بولنے کا موقع دیا اور اُس کا مطمع نظر جانا۔

اور جب وہ اُسے رقیہ ہال ڈراپ کرنے کے بعد گھر واپس جا رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر بشاشت تھی اور آنکھوں میں شوخی۔ ایک طویل عرصے بعد اُس نے Forget Me Not کی شوخ دُھن بجائی۔

اور ہال کی لفٹ کا بٹن دباتے ہوئے اُس لڑکی نے جس کا نام نجمہ شمشیر علی تھا اپنے آپ سے کہا تھا۔

''میں تو یونہی خوف زدہ ہو گئی تھی۔''

باب نمبر۱۱:

علی الصبح جاگنے کے بعد اُس کا سب سے پہلا کام چٹا گانگ اپنی فرم کے مینجر شمس الدین عُرف کورا کوفون پر اطلاع دینا تھا کہ وہ آج تقریباً دو بجے چاٹگام پہنچ رہا ہے اور یہ کہ وہ اُس کے لئے واپڈا ہاؤس ریزرو کرادے۔

''پر کیوں؟''

فون پر اُسے کورا کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔

''فرم کا گیسٹ ہاؤس خالی ہے ایسے میں واپڈا ہاؤس کی ریزرویشن کی کیا ضرورت ہے؟''

''ضرورت ہے۔آنے پر بتاؤں گا۔''

دریچے کا پردہ ذرا سرکا کر اُس نے باہر جھانکا۔ملگجا سا اُجالا بکھرا پڑا تھا۔غسل سے فارغ ہوکر وہ ناشتے کی میز پر آیا۔گھر سکون میں ڈوبا ہوا تھا۔ملازم کے قدموں کی چاپ اور برتنوں کی کھنکھناہٹ کبھی کبھی اِس سکون کو توڑتی تھی۔

طاہرہ اور بچے ہفتہ بھر ہوا کلکتہ گئے ہوئے تھے۔طاہرہ کا چھوٹا بھائی انور پٹی کینیڈا سے کوئی آٹھ سال بعد آرہا تھا۔سب بہن بھائی برسوں بعد اکٹھے ہورہے تھے۔بُلایا تو اُسے بھی شدّ ومد سے تھا اُس کی ساس کا دو دن مسلسل فون آتا رہا کہ انور پٹی تمہیں بہت یاد کرتا ہے اور تم سے ملنے کے لئے بے چین ہے۔

خود انور پٹی کا بھی فون تھا کہ یار مانتا ہوں تم بہت بڑی ذمّہ دار پوسٹ پر بیٹھے ہو۔معروف بندے ہو۔دیکھو ملنے کے لئے آجانا۔

اُس کے پیشِ نظر بھی تھوڑی سی اوُ تنگ تھی کہ چلو اِسی بہانے کام کے بوجھ سے تو

بندہ نکل آتا ہے۔

دو دن قبل ہی میاں بیوی کے درمیان زبردست قسم کی لڑائی ہوئی تھی۔اُس نے سخت پیچ وتاب کھایا اور تفریح کے خیال پر دو حرف لعنت کے بھیجے۔یہی وجہ تھی کہ جب طاہرہ اپنی بڑی بہن کے ساتھ کلکتہ جانے کے لئے تیار ہوئی۔جہاں آرا آپا اور دلدادہ آپا کا فون اُسے ملا کہ تم بھی چلے چلو نا۔بُہت سال ہوگئے ہیں تمہیں گئے ہوئے۔

اُس نے اپنے اندر کی تلخی کو دبا کر نرمی سے کہا۔

''آپا! طاہرہ تو جا رہی ہے۔میرے لئے مُشکل ہے۔سویڈن سے ایک ڈیلیگیشن آرہا ہے۔مجھے اُنکے ساتھ میٹنگ کیلئے ویسٹ پاکستان جانا ہے۔''

نوکر نے چائے دانی کوئی کوزی سے ڈھانپ دیا اور خود کھانے کے کمرے سے نکل گیا۔

''دن بدن دماغ خراب ہوتا جا رہا ہے۔ٹوسٹ پر مارملیڈ لگاتے ہوئے اُس نے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔

کھوٹے کھرے میں تمیز ہی نہیں رہی۔سلیم احمد خوندکر کے تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑگئی ہے۔''

زمین کی خریداری میں اُس کی اِس درجہ دلچسپی کہ میں کنال پر مُصر اور اُس کا کہنا کہ گھر کوئی روز روز بنایا جاتا ہے۔دو کنال سے تو ہرگز کم نہیں ہونا چاہیے۔پھر ''بناتی'' (ڈھاکہ کا پوش ایریا) میں ایسا پلاٹ جو اچھی جائے وقوع کے اعتبار سے بُہت سے لوگوں کے لئے کشش کا باعث تھا۔اُسے خالصتاً میرے لئے حاصل کرنے کی جدوجہد میں اُس کا ہلکان ہونا، کچھ کہنے، کچھ بتانے، کچھ واضح کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا۔محبت اور خلوص کے بغیر ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔خیر سے یہ ہیں کہ غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کے اژدہام میں ہی

اُلجھی رہتی ہیں۔اُس کی کسی بھی کاوش کو خاطر میں ہی نہیں لاتیں۔سمجھتی ہیں سلیم احمد خوند کر اُن کے سیدھے سادھے بھولے بھالے شوہر کو بیوقوف بنا کر اپنا اُلو سیدھا کر رہا ہے۔شوہر بھی چُو چہ بچہ ہے جسے بیوقوف بنایا جا سکتا ہے۔سارے زمانے کا شرانٹ اور زمانہ ساز آدمی جسے خوند کر لُوٹ لینا چاہتا ہے۔لاکھ سمجھاؤ پر مجال ہے جو اُس کے خانے میں کچھ بیٹھ جائے۔جب دیکھو زبان زہر ہی اُگلتی ہے۔سمجھ نہیں آتا اِس کی اچھی بھلی عقل پر پتھر کیوں پڑ گئے ہیں؟

انور پٹی سے اُس کی ملاقات اپنی منگنی پر ہوئی تھی۔بڑا ذہین اور انقلابی سا لڑکا دِکھتا تھا۔ایم ایس سی فزکس سے فارغ ہوا تھا۔نوکری کی تلاش میں تھا اور اچھی جگہ نہ ملنے پر بڑا اجر بز بھی تھا۔اجتباء الرحمٰن نے کہیں پُور بو پاکستان آنے کا کہہ دیا۔تڑ سے بولا تھا۔

''لو ڈھاکہ میں کیا دھرا ہے؟ بالکل پنڈ۔کلکتے جیسے بڑے شہر میں مجھے اپنے ڈھنگ اور مزاج کی نوکری نہیں مل رہی ہے۔وہاں جا کر تو آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکا والی بات ہو جائے گی۔نہ بابا نہ۔مجھے تو ہر صورت باہر نکلنا ہے۔''

اپنے چار روزہ قیام میں انور پٹی نے نہ صرف اُسے کمپنی دی بلکہ ہر طرح اُس کا خیال بھی رکھا۔انگلینڈ سے امریکہ اور امریکہ سے کینیڈا اپنی ہجرتوں کی کہانیوں سے وہ اُسے ہمیشہ باخبر رکھتا تھا۔

ملازم نے اُس کے کہنے کے مطابق اُس کی ضرورت کی تمام چیزیں اٹیچی کیس میں بند کیں اور اُسے ڈکی میں رکھ دیا۔نوکر کو ضروری ہدایات دے کر وہ کار میں بیٹھا اور اُسے سٹارٹ کیا۔

یہ بائیس فروری کی صُبح تھی۔اکیس فروری کا اہم دن گزر چکا تھا۔خلاف معمول اِس سال اُردو اور بنگلہ پر جھگڑا نہیں ہوا۔سابقہ سالوں کی طرح ٹوٹ پھوٹ تو ہوئی پر نسبتاً کم

پیانے پر۔

کار چلاتے چلاتے اُس نے ریڈیو آن کیا اور مختلف اسٹیشن ٹیون کرنے لگا۔ اُس وقت وہ خاصا مسرور نظر آ رہا تھا۔ نکھری اور خوشگوار صبح کا حُسن اُس کے چہرے اور آنکھوں میں بھی نظر آ رہا تھا۔

رقیہ ہال کے سامنے اُس نے گاڑی روکی اور اپنا کارڈ اندر بھجوایا۔ سب سے پہلے وہ اس لڑکی کو پک کرنا چاہتا تھا۔

اور بیک کوریڈور کی بیرونی دیوار پر کُہنیاں ٹکائے، ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑے کو تھامے وہ لڑکی جس کا نام نجمہ شمشیر علی تھا خود کو بہت تھکا تھکا محسوس کر رہی تھی۔ اُسکا جی چاہتا تھا وہ بیڈ پر گرے اور آنکھیں بند کر لے۔ کیونکہ پپوٹے اِتنے بوجھل سے تھے کہ آنکھوں کو کھولنا مشکل ہو رہا تھا۔

اصل میں چٹا گانگ جانے کی اُمنگ اور ترنگ اتنی شدید تھی کہ جس نے رات بھر خاصا مضطرب رکھا تھا۔ ساری رات ہی کچھ سوتے اور کچھ جاگتے گزری۔ ذرا آنکھ لگتی تو دیکھتی کہ وہ سب لوگ اُسے چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور وہ حیران پریشان اپنا سامان اُٹھائے اُن کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔

چٹا گانگ ہل ٹریکس کے بارے میں کہانیوں کی فینٹسی نے اُسے بے حال کر رکھا تھا۔ کاکسس بازار کی خوبصورتی کے جتنے چرچے تھے جی چاہتا تھا کہ اللہ کہیں پر لگ جائے، اُڑ کر وہاں پہنچ جائے اور دلکش نظاروں سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرے۔ رُوح کو سیراب کرے۔

اُسے تو اِس وہم نے بھی گھیرے میں لے رکھا تھا کہ انسان جس چیز کے لئے زیادہ بے چین ہو، زیادہ خواہش مند ہو، زیادہ مضطرب ہو۔ بالعموم ایسی خواہش کی تکمیل میں

کوئی نہ کوئی پھڈا پڑ جاتا ہے۔کچھ نہ کچھ آڑے آجاتا ہے۔

’’ارے بھئی اب جو پروگرام بنا ہے تو اللہ اِسے پروان چڑھا ہی دے بیچ میں کوئی روڑا نہ اَٹکے۔‘‘

رات کے تاریک لمحوں میں اُس نے کتنی بار یہ اپنے آپ سے کہا تھا۔

’’اب یہ بھی تو شوق کی انتہا ہی تھی کہ اُس اجنبی مرد کے اجنبی بیوی بچوں کی خیریت کی دُعائیں بھی مانگی گئی تھیں۔کیونکہ کسی کی بھی بیماری اور ناسازی طبع اُن کے پروگرام کا بیڑا غرق کرسکتی تھی۔

میز پر رکھی گھڑی دیکھی۔سوئیاں سات اور بارہ کے ہندسوں پر رقصاں تھیں۔

وقت تو سات بجے کا ہی تھا۔

وہ خود سے مخاطب ہوئی۔لیکن یہ تو ممکن ہی نہیں کہ وہ وقت کا خیال رکھے۔بڑے لوگ بالعموم لاپرواہ ہوتے ہیں۔وقت طے ہونے کے باوجود دیر سے پہنچنا فخر سمجھتے ہیں۔

اور ٹھیک اُسی وقت نوکر نے اُسے کارڈ دیا۔خوشی کی ایک لہر اُس کے انگ انگ سے اُٹھی اور اُسے مسُرور و شادمان کرگئی۔

تو گویا بڑے لوگوں کی لاپرواہی والا قیاس تو میرا غلط ثابت ہوا۔پر پروگرام کے یقینی تکمیل پا جانے کی سرشاری کی کیفیت والی لہر جو اُس کے اندر سے اُٹھی تھی وہ فوراً اُتر بھی گئی کیوں کہ اُس نے اپنے آپ پر نگاہ ڈالی تھی۔اِس نگاہ نے اُسے شرمندگی کے پاتال میں پھینک دیا تھا۔

اُلجھی اُلجھی پریشان وہ کوریڈور سے کمرے میں آئی۔دروازے میں اِک ذرا رُک کر اُس نے نوکر سے کہا کہ وہ اُس کے مہمان سے کہے کہ وہ بس ابھی آتی ہے۔

’’خدایا۔‘‘

اُس نے اپنے سراپے کو دیکھا۔ برش کرنا تھا۔ باتھ لینا تھا۔ چلو ناشتہ اتنا اہم نہیں تھا۔ اُس کا وقت بچایا جاسکتا تھا پر تیار بھی تو ہونا تھا۔ مائی گاڈ سارے کام کرنے والے تھے۔

وہ فوراً باتھ روم میں گھسی۔ نہانے کا اِرادہ چھوڑ کر اُلٹا سیدھا منہ دھویا۔ کپڑے بدلے اور خالی پیٹ چیزیں اُٹھا کر باہر بھاگی۔ کاموں کو برقی رفتار سے نپٹانے کے باوجود اُس نے پندرہ منٹ لے لئے تھے۔

اِس دوران صبیحہ ہال پہنچ چکی تھی۔

اسٹیرنگ پر دونوں ہاتھ رکھے اُس نے صبیحہ کو دیکھا اور کسی قدر تلخی سے بولا۔

''تم اگر میرے بارے میں زیادہ نہیں پر تھوڑا سا تو جانتی ہی ہو۔ خاص طور پر کہ مجھے انتظار کرنے سے چڑ نہیں نفرت ہے۔ خصوصاً وہ بھی لڑکیوں کا۔ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ سب کو ضروری اُمور پر بریفنگ دے دو کہ اُنہیں کِس کِس باتوں کا خاص خیال رکھنا ہے اور وقت کی پابندی تو سب سے اہم ہے کہ اِسی پر روزمرہ پروگرام کا انحصار ہوتا ہے۔ اب اِن کل کی چھوکریوں کے حضور خود اور گاڑی کو یوں کھڑا رکھنا میرے لئے تو ناقابلِ برداشت ہے۔

اگر آئندہ اِس امر کا خیال نہ رکھا گیا تو یہ طے ہے کہ میں آپ سب لوگوں کو وہیں چھوڑ کر واپس آجاؤں گا۔

صبیحہ سے اُس کے گہرے مراسم تو نہیں تھے پر کبھی کبھار کی لانگ ڈرائیو دوستی میں وہ اُس کی چند مخصوص عادتوں کے بارے میں اچھی طرح جانتی تھی۔ اِسی لئے گھبرا کر فوراً بولی۔

''میں نے اُنہیں تاکید کی تھی۔۔۔۔۔۔''

صبیحہ کے مزید کچھ کہنے سے پیشتر ہی وہ آ گئی۔ معذرت کا ایک لفظ بھی اُس سے

بولا نہ گیا۔ یوں اُس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہ تھی کہ وہ سرتاپا معذرت بنی ہوئی تھی۔ شرمسار سا چہرہ، ہاتھوں میں پکڑا بے ترتیب سا سامان، خاموش اور جھُکی جھُکی نگاہیں۔

اُس نے ایک گہری اور تنقیدی نگاہ اُس پر ڈالی۔ دروازہ کھولا۔ اُسے بیٹھنے کے لئے کہا۔

اُس کے چہرے پر چھائے خجالت کے بادلوں نے اُس کے غصّے کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ گاڑی جب بیت المنیرہ جانے کے لئے اُس نے ایئر پورٹ روڈ کی طرف موڑی تب اُس نے رُخ پھیر کر پوچھا۔

''میرا خیال ہے آپ نے ناشتہ بھی نہیں کیا ہوگا۔ پر آپ کرتی کیا رہیں۔''

وہ چُپ چاپ گُم سُم سر جھکائے ہاتھ میں پکڑی اشیاء سے کھیلتی رہی۔ جواب کیا دیتی کہ سوچوں کہ کن کٹھن گھیریوں میں پھنسی ہوئی تھی اور رات کیسے کٹی تھی؟''

اور جب اُس نے ہاتھ میں پکڑی اشیاء کو بیگ میں ڈال کر سمیٹنا چاہا۔ اُسے محسوس ہوا کہ کلائی کی وہ گھڑی جسے وہ جلدی میں باندھ نہیں سکی تھی وہ اُس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ چار سو روپے کی گھڑی جسے وہ یہاں آنے سے پہلے خرید کر لائی تھی۔ کلیجہ دَھک سے ہو کر رہ گیا۔ اُس نے جلدی جلدی بیگ کو ٹٹولا۔ دوسری چیزیں دیکھیں صبیحہ نے اُس کی یہ پھرولا پھرولی دیکھی تو پوچھا۔

اور اُس نے کہا۔ ''معلوم نہیں گھڑی کہاں گر گئی ہے؟''

اُس نے بھی یہ بات سُنی۔ گاڑی کی ایک طرف کھڑی کر کے گردن پیچھے موڑی اور نرم سی آواز میں کہا۔

''چیزیں اچھی طرح دیکھئے۔''

''اچھی طرح دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟ وہ کوئی تھی وہاں جو ملتی۔''

صرف ایک پل کے لئے اُس کا جی اپنی اُس خوبصورت اور مہنگی گھڑی کے یُوں گم ہونے پر یہ درخواست کرنے کو چاہا کہ اگر وہ تھوڑی سی دیر کے لئے گاڑی کا رُخ ہال کی طرف موڑ دے تو وہ وہیں کہیں کوریڈور، کسی فٹ پاتھ یا گیٹ کے پاس راستے پر پڑی ہوگی۔

پر لمحہ بھر کے لئے ایسا صرف سوچا ہی جا سکتا تھا۔ کہنا تو ناممکن سی بات تھی۔ اُس نے تو پہلے ہی خاصی دیر کروادی تھی۔

بیت المنیر ہ میں ثریا اور نازلی کا گھر تھا۔ خدا کا شکر تھا کہ وہ تیار اور گاڑی کے انتظار میں مین سڑک پر موجود تھیں۔ سرکٹ ہاؤس کے یوٹیرافلیٹز سے صفیہ شامل ہوئی۔

صفیہ کے والدین کا تعلق پنجاب کے ضلع سیالکوٹ سے تھا۔ اُس کا باپ علی گڑھ کالج سے گریجوایشن کے بعد کلکتہ میں سیٹ ہو گیا تھا۔ تقسیم کے بعد وہ پُورب و پاکستان آ گیا اور پھر یہیں کے ماحول میں رَچ بس گیا۔ اُس کی دونوں بڑی بہنیں بنگالی گھروں میں بیاہی گئی تھیں۔

گاڑی کومیلا روڈ پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔

پتہ نہیں کون سا اسٹیشن تھا۔ بُہت اچھے گیت آرہے تھے۔ سبھی خوش وخرم تھے اور خوب خوب باتیں ہورہی تھیں۔ جب اُس نے پیچھے رُخ پھیر کر اُس سے کہا۔

''لڑکی تم اتنا چہک رہی ہو۔ تمہیں گھڑی گُم ہونے کا ذرا افسوس نہیں۔''

''اب کیا افسوس کروں؟ چیزیں گُمانا تو میری پرانی عادت ہے۔ واپس آ کر ابو کو لکھوں گی نئی بھیج دیں گے۔''

اُس نے اپنی خوبصورت لابنی گردن اُونچی کی۔ نتھنوں کو پھلایا اور اپنے آپ سے

کہا۔

''اب جو نقصان ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ بار بار اظہار سے اپنی تھڑ دلی اور چھوٹے پن کو ظاہر کروں۔ یہ تو مناسب نہیں اور ایسا کرنے سے اگر کھوئی ہوئی چیز واپس مل جائے تب بھی ایک بات ہے۔ جب یہ سب ممکن نہیں تو فائدہ؟''

یوں یہ اور بات تھی کہ ہر پندرہ بیس منٹ بعد اُس کے دل سے ایک درد بھری ہوک سی اُٹھتی اور اُسے بے کل کر جاتی۔

''ارے ابھی تو پہننے کا چاؤ بھی پورا نہیں ہوا اور گم بھی ہو گئی۔ جانے کس کے جوگے لگی۔''

باب نمبر۱۲:

چڈا گا نگ کے اِس اعلیٰ درجے کے چینی ریستوران میں کھانا کھاتے ہوئے اُسے شدید خفت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ایسے کھانے اور کھانوں کے یہ ایٹی کیٹس بھلا اُس نے کب دیکھے اور کہاں سیکھے تھے؟ وہ تو اپنے گھر کے چھوٹے سے باورچی خانے میں کالج جانے سے پہلے اور واپس آ کر چھوٹی سی چوبی چوکی پر جا کر بیٹھتی ۔اماں گرم گرم پھلکے اُتارتی جاتی اور وہ سب بہن بھائی باری باری کھاتے جاتے ۔کبھی کبھی جب اتفاق سے وہ اکٹھے ہو جاتے تب اُن کے درمیان لڑائی ہوتی پہلا پُھلکا میرا۔وہ زور سے چلاتی ۔

''مجھے بُہت بھوک لگی ہے۔پہلا میں کھاؤں گا۔''

اُس کا چھوٹا بھائی یونیفارم اُتارے بغیر ہی بھاگ کر آجاتا اور اُسے پیچھے دھکیلنے لگتا۔

کبھی کبھی ماں چہرے پر محبت و پیار کی مسکراہٹیں سجائے اُنہیں دیکھتی اور پیار بھری خفگی سے کہتی۔

''لڑتے کیوں ہو میں نے تو آنکھ جھپکتے پُھلکوں کا ڈھیر لگا دینا ہے تم کھانے والے بنو۔''

اور واقعی ایک کے بعد ایک روٹی توے سے اُتر کر چنگیر میں آتی جاتی اور وہ سب کھاتے جاتے۔

کبھی کبھی ماں کھانا ختم ہونے کے بعد اُن سبھوں سے کہتی ۔

شکر ادا کرو اللہ کا۔

باقی سب تو خاموش ہی رہتے پر وہ ضرور کہتی۔

"ماں تم بھی کمال کرتی ہو۔کیوں شکر ادا کریں؟ اُس نے کونسا ہمیں انڈے مرغے کھانے کو دیئے ہیں۔ہر روز مُسور کی پتلی دال۔یہ بھی نہ دے گا تو کیا خاک دے گا کھانے کو۔

ماں توبہ توبہ استغفار کہتے کانوں کو ہاتھ لگاتی اور ساتھ ہی اس پر گالیوں کی بوچھاڑ کردیتی۔اُس کے بھائی بہن ہنستے۔منجھلا والا ماں کو مزید چڑانے کیلئے کہتا۔

''ماں مجھی ٹھیک کہتی ہے۔دیکھو نا مسور کی دال کھا کر شکرادا کرنا شروع کر دیا تو اللہ کو اتراہٹ آجائے گی۔اور وہ ہمیں کبھی اچھے کھانے نہیں دے گا۔

اس سے پیشتر کہ ماں جوتا اٹھا کر اُسے مارتی وہ بھاگ کھڑا ہوتا۔بڑا بھائی ماں کے گھٹنے پکڑ لیتا اور ہنستے ہوئے کہتا۔

واہ ماں تم تو یونہی خفا ہونے لگ جاتی ہو۔ارے یہ تو ہمارا اُس نیلی چھت والے سے ہنسی مخول ہے۔ماں اس پر اور بھی تلملاتیں۔

''لو وہ ان کے ہنسی مخول کے لئے ہی تو ہے۔میں کہوں تمہاری عقلوں پر کیوں جھاڑو پھر گیا ہے۔یا زیادہ پڑھنے سے تمہارے دماغ خراب ہوتے جارہے ہیں۔''

''میں تو حیران ہوں۔وہ ماتھے پر ہاتھ مارتی تمہیں کالجوں میں یہی تمیز سکھاتے ہیں۔یہی بتاتے ہیں کہ اُس دو جہاں کے بادشاہ کی شان میں ایسے گستاخی کے کلمات نکالو۔''

''ارے ماں۔'' بڑا بھائی دُبلی پتلی ماں کو اپنے کلاوے میں بھر کر چکریاں دیتا اور کہتا۔

''تم کڑھا مت کرو۔وہ انسانوں کی طرح تھڑ دلا نہیں۔بڑا جگرے والا ہے۔غصہ نہیں کرتا ہم بچوں کی باتوں کا۔''

ایسی ہی ٹھٹھول بازی میں وہ ہنستے مُسکراتے قہقہے لگاتے بکھر جاتے۔

ہلکی نیلی دیواروں والے اُس بے حد خوبصورت کمرے میں جس کی چھت سے لٹکتے فانوسوں سے چھنتی روشنی بڑا لطیف سا احساس پیدا کر رہی تھی۔ آرکسٹرا یُہت دھیمے سُروں میں بج رہا تھا۔ چکنی شفاف میزوں پر گلاسوں میں ٹھنسے سفید نیپکن اچھے لگ رہے تھے۔ چُھری کانٹوں کی کھنک، خوش ذائقہ کھانوں کی مہک، ساتھی لڑکیوں کی کانٹوں چمچوں سے کھیلتی اُنگلیاں، داہنے ہاتھ بیٹھے ہائی جینٹری سے تعلق رکھنے والے مرد جو کھانے کے ساتھ ساتھ بڑی اینٹلیکچوئیل قسم کی گفتگو کر رہے تھے۔ سبھی ٹھیک تھے۔

اور اگر ٹھیک نہیں تھی تو وہ لڑکی جو بھوک سے بے حال ہو رہی تھی۔ جس کا جی چاہ رہا تھا کہ میز پر پڑے اُن خوشنما کھانوں پر ٹوٹ پڑے اور بغیر ڈکار لئے سب کچھ ہضم کر جائے۔

پر یہ کہیں ممکن تھا؟

اور وہ وجیہہ اور پُر وقار چہرے والا مرد جو اپنے ساتھی مرد کے ساتھ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ اُس لڑکی کی بھی ایک ایک حرکت کا تفصیلی جائزہ لے رہا تھا۔

اُس کی خوبصورت پیشانی اور ہونٹوں کے بالائی حصّے پر پسینے کے ننھے مُنے قطروں نے گویا ہیرے سے سجا دیئے تھے۔ ایسا من موہ لینے والا حُسن جسے باہر کی دُنیا کی ہوا ہی نہ لگی ہو کو دیکھتے ہوئے محظوظ بھی ہو رہا تھا۔

کھانے کے بعد جب وہ دونوں تھوڑا سا آرام کرنے کی غرض سے ریسٹ ہاؤس کے کمرے میں آئے۔ شمس الدین عرف گورا نے اُسے تعجب آمیز حیرانگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار میں حیران ہوں۔ ان اچھی بھلی معزز اور شریف گھروں کی لڑکیوں کو تم کیسے لے آئے؟

وہ بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔گورا کی اِس بات پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔سگریٹ جلایا اور گہرا کش لیتے ہوئے خفیف سا مسکرایا بھی ۔

خیال رہے میں بھی کم معتبر نہیں ۔دوسرا رہا سوال لانے کا تو بھئی اِس کا کریڈٹ مجھے نہیں اُس ویسٹ پاکستانی لڑکی کو جاتا ہے جس کا نام نجمہ ہے ۔تھوڑا سا کردار صبیحہ کا بھی ہے۔

تم کچھ زیادہ چوزنہیں ہو گئے ہو۔بھابھی کو پتہ چل گیا تو تمہاری کھنچائی تو جو ہوگی سو ہوگی ۔میری کھلاڑی کی بھی خیر نہیں ۔

''کھلی چھٹیاں۔طاہرہ آج کل کلکتے میں ہے۔''

''اوہو۔تبھی۔'' گورا نے قہقہہ لگایا۔

اور اُس نے اِس بات پر کچھ کہنے کی بجائے یہ پُوچھا۔

''کہو رانگامتی چلتے ہو؟''

''نہیں یار بُہت کام ہے ۔پرسوں کا کیس بازار کے لئے ساتھ دوں گا۔''

کوئی دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد لڑکیاں نہانے ،لباس تبدیل کرنے کے بعد تازہ دم چٹا گانگ شہر کی سیر کے لئے تیار تھیں۔ہنستے مُسکراتے چہروں اور رنگا رنگ ملبوسات سے اُٹھتی ہوئی مختلف پرفیومز کی بھینی بھینی خوشبوئیں اُڑاتی ،چہکتی ،گُنگناتی لڑکیاں جب اُس کے کمرے میں داخل ہوئیں اُسے محسوس ہوا تھا جیسے بہار رقص کرتی جھومر ڈالتی اُس کے آنگن میں اُتر آئی ہے ۔

وہ اُس وقت اپنی ذاتی کمپنی کے ڈرائیور کو گاڑی کے بارے میں ہدایات دے رہا تھا کہ صبح رانگامتی کیلئے اُسے کونسی گاڑی چاہیے ہوگی۔

بس یہ اُس کا کمال تھا کہ لڑکیوں کے گاڑی میں بیٹھنے سے قبل اُس نے اِس خوبی

سے ہیر پھیر کیا کہ نجمہ اُس کے پاس اگلی نشست پر بیٹھی۔

رانگامتی کا راستہ بُہت خوبصورت تھا۔ ریڈیو پر نشر ہونے والے گیت بھی اتفاقاً ایک تسلسل سے کمال کے تھے۔امنگیں بیدار کرنے اور ہلچل مچانے والے۔پاس بیٹھی لڑکی نہ صرف حد درجہ حسین تھی بلکہ معصوم اور بھولی بھالی عین اُس کی دیرینہ تمنا اور آرزو کے مطابق۔وہ شگفتہ پھول کی طرح کِھلا گاڑی چلانے کے ساتھ ساتھ اُن سب کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

ثریا، نازلی، صفیہ اور صبیحہ بھی زور وشور سے باتوں میں جُتی ہوئی تھیں۔وہ البتہ خاموش تھی۔دائیں بائیں دیکھتے ہوئے معلوم نہیں اُسے کیا ہوا۔دل شدت سے دھڑکا۔ سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔اُس نے سر سیٹ کی پُشت سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

اُس نے یہ سب دیکھا اور گاڑی سڑک سے نیچے اُتار کر روک دی۔

''باہر نکلو۔تازہ ہوا میں تھوڑی سی چہل قدمی کرو۔''

میناؤں کی طرح چہکتی وہ سب بھی چونکیں۔چاروں نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے اُس سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟

اُس نے اصرار سے اُسے باہر نکالا۔ٹھنڈی خوشگوار ہوا اُس کے چہرے سے ٹکرائی۔اُس کے وجود سے بغل گیر ہوئی۔اُسے سکون سا محسوس ہوا۔جب وہ دوبارہ گاڑی میں بیٹھنے لگی۔اُس کا جی چاہا وہ صبیحہ سے کہے کہ وہ آگے بیٹھے۔لیکن وہ ایسا نہ کہہ سکی۔

رانگامتی پہنچے تو جنگل میں منگل کا ساسماں تھا۔کھیدا کھیلا جا رہا تھا۔مرکزی حکومت کے اعلیٰ عہدیداران آئے ہوئے تھے۔سارے سرکٹ ہاؤس پُر تھے۔

وہ تھوڑا سا گھبرایا اور اپنے آپ سے بولا۔

''کمال ہے مجھے تو یاد نہیں رہا۔پر اُس کمبخت گورا نے بھی بات نہیں کی۔اب کسی

نہ کسی واقف کار کا ملنا ناگریز ہے۔اُس نے کوفت اور بیزارگی سے سوچا۔

اُونچی اور اہم پوسٹوں پر کام کرنے کا ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ بندے کی نجی زندگی فوراً نگاہوں میں آ کر زبانِ زدِ عام ہو جاتی ہے۔بہتر ہے لڑکیوں کو اکیلے ہی گھومنے پھرنے دیا جائے۔

کسی محفوظ سے ہوٹل میں کمرہ ڈھونڈنے کی ساری کوشش اُس نے اکیلے کی۔

کمرے ملے تو ضرور پر صرف دو۔

وہ متذبذب میں ڈوبا دیر تک سوچتا رہا اور پھر اُن کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''بھئی فیصلہ کرلو لڑکیو۔کیا ہونا چاہیے؟ کمرہ چھوٹا ہے اور تمہیں اس میں تنگی تو ضرور ہوگی۔پر مجبوری ہے۔''

صورت حال کی سنگینی اُن کے سامنے بھی تھی۔وہ سب بھی اس سے آگاہ تھیں۔

وہ تو خاموش ہی تھی۔ثریا اور صبیحہ نے کہا۔

''خیر ہے۔رات ہی تو گذارنی ہے۔''

لہذا ''خیر ہے'' کہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

''ہر طرف سے جواب سُن سُن کر مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے یہ رات رانگامتی کی سڑکوں پر ہی گذرے گی۔''

صبیحہ نے سامان کو کمرے میں سلیقے سے رکھتے ہوئے کہا۔

چیختے چلاتے اور شور مچاتے انسانوں سے پُر وسیع وعریض ڈائننگ ہال میں غربی کونے کی میز پر بیٹھتے ہوئے اُسے احساس تک نہ ہوا کہ وہ اُس کے داہنے ہاتھ بیٹھا ہوا ہے اور مینو کارڈ پر جھکا مختلف آئٹمز پر نشان لگانے میں مصروف ہے۔

وہ ایک بار پھر اُسے اپنے اتنے قریب دیکھ کر ساری جان سے لرزی تھی۔

''ستیاناس دوپہر بھی بھو کی ہی رہی تھی اوراب بھی لگتا ہے خالی پیٹ ہی اُٹھوں گی۔بیٹھ گیا ہے میرے کلیجے پر چڑھ کر۔''

اُس نے غصّے اور بے چارگی سے اپنے آپ سے یہ کہا اور نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹنے لگی۔

ساس کا پیالہ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے اُس نے کہا۔

''سوپ میں اِسے ڈالو۔اچھی طرح ملاؤاور پھر کھاؤ۔لذیذ لگے گا۔''

کھانے کے دوران اُس نے یوں تو ساری لڑکیوں کی طرف ہی توجہ دی مگر اُس کا خصوصی خیال رکھا اور وہ تھی کہ خجالت کے بوجھ تلے دَبی جا رہی تھی۔

''ارے یہ لوگ کیا سوچتی ہوں گی؟''

اُس نے بار بار چور آنکھوں سے اُنہیں دیکھا اور اپنے آپ سے کہا۔

ثریا یا نازلی اور صفیہ کو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔روشن اور آزاد خیال گھرانوں کی پُروردہ وہ الٹراموڈرن لڑکیاں جو اُس کی دوست بھی تھیں اور اُس کے ساتھ مخلص بھی۔اُس وقت تو یوں بھی وہ باتیں کرنے اور کھانا کھانے میں جُتی ہوئی تھیں۔

ہاں البتہ صبیحہ کی آنکھوں میں اُس نے عجیب نفرت بھرے جذبات محسوس کئے تھے۔

''لعنت ہے اِس پر۔'' اُس نے اپنے دل میں اُسے کوسا۔

''بھلا سنپولیے جیسا زہر اُس نے کیوں اپنی آنکھوں میں بھر لیا ہے؟ اُس کا اپنا کوئی چکر ہوگا۔''

کھانا کھانے کے بعد وہ سب باہر آ گئے۔فضا تاریک تھی۔سارے میں سناٹا تھا۔

دکنی ہواؤں میں تیزی تھی۔ یہ تیزی بالوں کو اُڑائے دیتی تھی۔ بار بار منہ کی طرف دوڑتے بھاگتے بالوں کو روکتے روکتے وہ عاجز آگئی تھی۔

دائیں طرف ندی تھی۔ ندی کے موڑ کے پاس ہی پہاڑی پر پاور ہاؤس تھا۔ اِس سناٹے میں مشینوں کی گھڑگھڑاہٹ بڑی واضح تھی۔

وہ چاروں سڑکوں پر ٹہلتی رہیں۔ صبیحہ کمرے میں چلی گئی تھی اور وہ لاؤنج میں بیٹھا سگار پیتا اور اگلے دن کی پلاننگ کرتا رہا۔

صُبح وہ بُہت سویرے جاگی تھی۔ سب ابھی سوتے تھے۔ پنجوں کے بل چلتی وہ باہر آگئی۔

صُبح کا پُرنور اُجالا سارے میں بکھرا ہوا تھا۔ اسوک کے پھولوں نے سبزے کی طراوت نے اور سرکٹ ہاؤس کی دیواروں پر کاسنی پُھولوں کی بیلوں نے فضا کو حسین بنایا ہوا تھا۔ وہ دیر تک وہاں بیٹھی فطرت کے حُسن کو دیکھتی رہی اور اُس وقت چونکی جب ثریا اُسے تلاش کرتی وہاں آئی۔

''عجیب تھرل سیکر ہو تم بھی۔''

''ارے میں تو تم لوگوں پر کھول رہی تھی۔ اتنی خوبصورت جگہ پر دن چڑھے تک سونا اور صُبح کے حُسن کی دید سے محروم ہونا تو نری بدذوقی ہے۔''

''اچھا ورڈزورتھ کی بھتیجی۔ چلو اُٹھو۔ ناشتے کے لئے جانا ہے۔''

ناشتے پر ہی اُس نے اُنہیں بتایا کہ اُن کے سیر سپاٹے کا اُس نے انتظام کر دیا ہے وہ اُنہیں آج کمپنی نہیں دے گا۔ اُسے یہاں آئے ہوئے کچھ لوگوں سے ملنا ہے۔

چائے کا سِپ لیتے ہوئے اُس نے کپ کے کناروں سے جھانک کر اُس لڑکی کو دیکھا تھا جس کا چہرہ سُرخ گلاب کی طرح کِھل اُٹھا تھا۔ وہ سب سمجھا اور مُسکراہٹ ہونٹوں

میں دبا گیا۔

ڈرائیور بمعہ گاڑی حاضر تھا۔وہ اُس میں بیٹھیں اور گاڑی کولتار کی سڑکوں پر چکر کاٹنے لگی۔کرنافلی دریا نیچے زور شور سے بہہ رہا تھا۔اُس نے دیکھا لکڑی کے بڑے بڑے گٹھے پانیوں پر بہتے جارہے تھے۔ڈرائیور نے بتایا۔

''یہ گٹھے چندر گونا پیپر مل کے لئے جا رہے ہیں۔''

ٹرانسپورٹ کے اخراجات سے بچنے کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ثریا معاشیات کی طالبہ ہونے کی وجہ سے معاشی بچت کے پہلوؤں کا جائزہ لے رہی تھی۔سرکاری جیپ گاڑیاں سڑکوں پر دندناتی پھر رہی تھیں۔

ایک جگہ گاڑی رُک گئی۔وہ سب نیچے اُتر آئیں۔

وہ لمبی چوڑی جھیل کے کنارے پر کھڑی تھیں۔جس میں موٹر کشتیاں چلتی تھیں۔بانسوں سے بنے ریسٹ ہاؤس نظروں کو بھلے لگتے تھے۔کرنافلی کا ڈیم جہاں ہائیڈ روالیکٹرک پاور کا ئیہت بڑا اسٹیشن جو سارے صوبے کے کارخانوں کو بجلی سپلائی کرتا تھا۔

کشتیوں میں بیٹھ کر انہوں نے جھیل کی سیر کی۔کنارے پر پہنچ کر اُس داستان کو سُنا جو اُس جھیل کے بننے سے یہاں دفن ہو گئی تھی۔

چکمہ راجے کی راجباڑی،دارجلنگ کے کونونٹ کی پڑھی ہوئی اُس کی حسین رانی اُن کا محل اور اُن کی محبت کی کہانی۔

دُھوپ بہت چڑھ آئی تھی جب وہ رانگامتی کے بازار میں پہنچیں۔ہاٹ(بازار) میں مختلف جگہوں کے سُوتی کپڑے،مونگے،موتیوں کے ہار اور بُندے،قیمتی پتھر۔وہ کانوں میں چپٹی ناکوں اور تکونی آنکھوں والی چکمہ عورتیں جو مہارت سے بھاؤ تاؤ کرتی تھیں۔

اُنہوں نے اپنے جسموں پر جو کپڑے پہن رکھے تھے وہ ویسے ہی تھے جیسے وہ

بچپن میں اپنی گڑیوں کو پہنایا کرتی تھی ۔پاؤں سے اُونچے تنگ سکرٹ اور بلاؤز نما۔

ثریا اور نازلی نے کافی چیزیں خریدیں ۔صفیہ نے لمبے لمبے پائپ پیتی پہاڑی عورتوں سے کھُل کر باتیں کیں۔ اُنہیں غصہ آ رہا تھا اُن پر۔ کمبختیں خود محنت کرتی ہیں اور مردوں کو تاڑی چرس پینے کے لئے چھوڑ رکھا ہے۔

''نہیں بھئی اب اتنے بھی ہڈ حرام نہیں جتنے آپ سمجھ رہی ہیں۔'' ڈرائیور نے وضاحت کی۔

''اناناس اُگاتے ہیں۔چاول بوتے ہیں۔خطرناک جنگلوں سے بانس کاٹ کاٹ کر نیچے لاتے ہیں۔''

آپ لوگوں کی اطلاع کے لئے ریڈ چائنا یہاں سے بُہت قریب ہے۔اُن پہاڑوں سے ذرا سا آگے بڑھ کر۔

ساری لڑکیوں نے تجسس سے بھری آنکھوں سے نیلے دھوئیں کے غبار میں لپٹی پہاڑیوں کو دیکھا اُن کا بس نہ چلتا تھا کہ کیسے جست لگا کر ریڈ چائنا کے دامن میں پہنچ جائیں۔

کپتائی جھیل کی سیر سے لُطف اندوز ہوئیں۔ہریالی، تازہ جھینگوں کا شوربہ، روسٹ اور رسلاد۔کھانے کا مزہ آیا۔اُس نے ڈٹ کر کھایا۔اگلی پچھلی کسر نکالی اور ساتھ ہی یہ دُعا بھی کی۔

''پروردگار کیا ہی اچھا ہو کہ ہمارے اُس گارجیئن کو روز کوئی نہ کوئی کام پڑ جائے اور وہ ہمیں اکیلے سیر سپاٹے کے لئے بھیج دیا کرے۔''

اور جب واپسی کے لئے چٹا گانگ کے لئے روانہ ہونے کے لئے گاڑی میں بیٹھے وہ اُنہیں بتا رہا تھا کہ اگر اُس کے پاس وقت ہوتا تو وہ اُنہیں بندر بن کا علاقہ دکھاتا۔

بندر بن کے جنگلوں میں چکمہ اور مونگ قبیلوں کے لوگ بانسوں کے جھونپڑوں میں زندگی گذارتے ہیں۔ خوبصورت اور خونخوار جانور اُن کے ساتھی بھی ہیں اور دشمن بھی۔ اِن جنگلوں میں دلکش پہاڑی لڑکیاں جب سیرونگ باندھے گزرتی ہیں۔ تب جنگل اتنے خوفناک نظر نہیں آتے۔ یہاں بُدھ بھکشو بھی ملتے ہیں۔ دفعتاً اُس نے رُخ پھیر کر پیچھے اُس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''نجمہ آپ نے کبھی بدھ بھکشو دیکھے ہیں۔''

اُس نے سادگی سے اپنی لانبی پلکیں جھپکائیں اور سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولی۔

''نہ میں نے دیکھے ہیں اور نہ مجھے اُن کے متعلق کچھ علم ہے۔''

شام یقیناً بہت خوبصورت ہوگی۔ شفق ضرور خلیج بنگالہ پر اپنا حُسن بکھیر رہی ہوگی۔ مگر چٹا گانگ کی نیو مارکیٹ کی Escalators پر بار بار اُترتے اور چڑھتے ہوئے اُن لڑکیوں کو سلونی شام کے حُسن سے لُطف اندوز ہونے کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ البتہ ضرور چاہ رہا تھا کہ اس وقت انہیں ساحل پر ہونا چاہیے۔ رانگامتی سے واپسی پر آرام کرنے کے بعد وہ نیو مارکیٹ میں آ گئے اور اب لڑکیاں مارکیٹ سے نکلنے کا نام نہ لے رہی تھیں۔

ایک دُکان سے اُس نے چند ویو کارڈ خریدے۔ بیرونِ ملک اپنے تینوں بہن بھائیوں کے نام پتے اُن پر لکھے۔ پہلی بار اُس نے اُن کے ناموں کے ساتھ اپنے باپ کا نام لکھا اور اپنے نام کے ساتھ بھی۔

اگلے دن وہ کاکس بازار میں تھے۔ دوپہر کو چلے تھے اور مغرب کے وقت وہاں پہنچے۔ کھانے سے فارغ ہو کر دومنزلہ ریسٹ ہاؤس میں آئے۔ بستر پر نیم دراز ہوئی تو غنودگی کے بوجھ سے آنکھیں بند ہونے لگیں۔ کانوں میں ملحقہ کمرے سے آتا شور مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح لگ رہا تھا۔

نازلی ''بابل تیرا نیرا چھوٹو جا ہے ہے'' اُونچے اُونچے گا رہی تھی۔ساحل سے موجوں کی مہیب آوازیں فضا کو بُہت پُراسرار بنا رہی تھیں۔کھڑکی کے شیشوں سے وی۔آئی۔پی ریسٹ ہاؤس کی سفید عمارت لگی کبوتری کی طرح نظر آ رہی تھی۔

وہ نیند کے غبار میں ہولے ہولے ڈوبے جا رہی تھی۔سب لوگوں نے اُسے کہا بھی کہ وہ بیٹھےاور تاش کھیلے۔پر اُسے تاش کھیلنا آتا ہی نہ تھااور اپنے آپ کو اس محفل میں اجنبی محسوس کرنا اُسے عجیب سا لگتا تھا۔خجالت اور شرمندگی کے احساسات سارے سر میں دوڑنے لگتے تھے۔تھکاوٹ اور نیند کی آڑلی۔یوں بھی وہ کچھ نڈھال سی ہو رہی تھی۔

صُبح جب اُس کی آنکھ کھُلی۔باتھ رُوم سے شل شل پانی کے گرنے کی آواز آ رہی تھی۔صفیہ دوسرے بیڈ پر بیٹھی تھی۔اُس کی کھُلی آنکھیں دیکھ کر بولی۔

''خدا کا شکر ہے کہ تم بیدار ہوئیں۔لگتا تو یوں تھا جیسے اب کوئی صور اسرافیل ہی بجائے گا تو تمہاری نیند ٹوٹے گی۔رحمان بھائی کب سے چلا رہے ہیں کہ تم لوگوں کو بُہت سویرے ساحل پر جانا چاہیے۔دن چڑھے لہروں کا اُتار چڑھاؤ کم ہو جاتا ہے۔''

صفیہ بڑی لاأبالی قسم کی لڑکی تھی۔من موجی سی۔اُس نے اُسے ٹام بوائے کا نام دے رکھا تھا۔آنکھ کھُلتے ہی اُس ٹام بوائے کا یہ بورسا لکچر اُسے ناگوار گذرا۔اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی پر اپنے اُوپر ایک خوش رنگ قیمتی کمبل دیکھ کر حیرت زدہ سی ہو گئی۔

''ارے یہ کس کا کمبل ہےاور میرے اُوپر اِسے کس نے ڈالا؟''

''بھئی رحمان بھائی اپنا ڈال کر گئے تھے۔رات بُہت ٹھنڈ ہو گئی تھی۔تم تو دُھت سو رہی تھیں۔''

صفیہ نے یہ سب بتانے کے ساتھ ساتھ تکیہ اُٹھا کر دھپ سے بیڈ کی پائنتی پر مارا اور اُس پر سر رکھتے ہوئے غسل خانے کی طرف رُخ کرتے ہوئے چلائی۔

"بھئی صبیحہ بیگم اگر آپ باتھ رُوم سے جلدی نکل آئیں تو یہ بندی آپ کی ممنون ہوگی۔ پلیز اپنے اشنان کو ذرا مختصر کر دیجئے نا۔"

وہ گُم سُم بیٹھی تھی۔ صفیہ نے کمبل ڈالنے کا ذکر عمومی انداز میں کیا تھا جیسے یہ کوئی خاص بات نہ ہو۔

کسی کے لئے خاص بات ہو یا نہ ہو پر وہ تو جی جان سے دہل گئی تھی۔ اُس کا دل سینے میں اِس شدت سے دھڑکا تھا جیسے وہ گوشت پوست کے سارے پردے چیر کر ابھی باہر نکل جائے گا۔

وہ کبھی اتنی اہم بھی ہو سکتی ہے کہ ایک اعلیٰ افسر اُس پر رات کو کمبل ڈالتا ہے۔ اِس ڈر سے کہ کہیں اُسے سردی نہ لگ جائے۔ اتنا خیال تو جننے والی ماں نے بھی کبھی نہ کیا تھا۔ وہ اُنہیں پیدا کرنے کی ذمہ دار ضرور تھی پر ماؤں والے لاڈ نخرے کبھی نہ کئے۔ اول تو وہ سب بھائی بہن بڑے سخت جان تھے۔ سخت سردیوں میں ایک قمیض میں ہی گھومتے پھرتے۔ بیمار ہونا تو درکنار نزلہ زکام بھی قریب نہ پھٹکتا۔ اگر خدانخواستہ کبھی کوئی بیمار پڑ جاتا تو بھی خاص پرواہ نہ ہوتی۔ پانچ چھ دن بیماری کے تھپیڑے سہہ کر وہ خود ہی ٹھیک ہو جاتے۔ نہ کبھی کوئی فکرمند ہوتا۔ نہ کوئی مہنگی دواؤں کے چکر میں پڑتا۔ بس معمولی سا دوا دارو ہوتا۔ اِسی میں آرام آجاتا۔

کاکسس بازار کے ستر 70 میل لمبے سنہری ساحل پر بیٹھے خلیج بنگال کی اُونچی اُونچی لہروں سے وہ ذرا بھی لُطف نہ اُٹھا رہی تھی۔ رحمان بھائی اور رگورا دونوں ریسٹ ہاؤس میں ہی تھے۔ لڑکیاں اکیلی ساحل پر آئی تھیں۔

نازلی اور ثریا دونوں پانی میں بہُت دُور تک چلی جاتیں۔ لہریں آتیں اور اُنہیں گردن گردن تک بھگو جاتیں۔ صفیہ ریت سے گھروندے بنا رہی تھی اور صبیحہ تصویریں

اُتارنے میں مصروف تھی۔

پریشانی سے اُس نے سر جھٹکا اور اُلٹی سیدھی سوچوں سے چھٹکارہ پانے کی کوشش کی۔ وہ دراصل اِن معاملوں میں بالکل کوری تھی۔ یوں ہر انسان کی طرح اُسے بھی چاہے جانے کی شدید تمنا تھی۔ لڑکیوں سے جب اُن کے فسٹ اور سیکنڈ کزنوں کے قصّے سُنتی تو مارے رَشک وحسد کے جل جل جاتی۔ خیر سے خالہ زادوں اور پھوپھی زادوں کی تو اُس کے گھر میں بھی کمی نہ تھی پر وہ سب کم بخت جُوتیاں مارنے کے قابل تھے۔ ایک سے ایک بڑھ کر پُغد اور کاوٗ بوائے کہ اُنہیں دیکھنے کو بھی جی نہ چاہے کجا کہ اُن پر محبت کی نظر ڈالی جائے۔ گھر میں کچھ دُور رنزدیک کے رشتہ داروں کے بیٹے بھی پڑھنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ وہ بھی اُسے پسند نہ تھے۔ اُن کے طور طریقوں پر دیہاتی پن کی گہری چھاپ تھی۔

کالج سے آتے جاتے وقت دوسرے کالجوں اور یونیورسٹی میں پڑھنے والے لڑکوں سے مستقل قسم کا واسطہ رہتا تھا کیونکہ آمد و رفت کے اوقات تقریباً ایک جیسے ہی تھے۔ پر گھر کے سخت اور کڑے ماحول نے ذہن کی طنابیں یوں کس کر رکھیں کہ اِن میں ذرا سی کبھی ڈھیل نہ پیدا ہونے دی۔

باب نمبر۱۴:

''تُف ہے اِس لُتری پر۔''

اتنی لگائی بُجھائی کی اُس نے رحمان بھائی سے کہ خود چیزیں پہچانے کی بجائے اُس نے اُنہیں اِس چھمک چھلّو کے ہاتھ بھیج دیں اور وعدہ کرنے کے باوجود خود نہیں آئے۔

ثامہوائے سرپٹ بھاگتے گھوڑے کی طرح بولے جارہی تھی۔

''مائی گاڈ! انتہائی جیلس اور رلو مینٹیلیٹی کی عورت۔اگر معلوم ہوتا تو کبھی اُس کے ساتھ قدم نہ اُٹھاتے۔''

حمیدہ پا پیا کے لہجے کی تلخی نے اُس کے خوبصورت چہرے کو بھی اچھا خاصا برہم کر دیا تھا۔

ہاں ذرا اندر تو دیکھنا تھا مہریوں کی طرح کیسے ہانک لگائی۔

''اپنا اپنا سامان لے لو۔گنوار کہیں کی۔ایڈیٹ۔''

نازلی بھی غصّے سے مشتعل ہوگئی۔

صبیحہ بہت فضول انسان ثابت ہوئی تھی۔سفر کے آخری دنوں میں اُس کا رویہ اتنا خراب ہوگیا تھا کہ اُن چاروں نے کڑھ کر بار بار سوچا کہ اِسے تو کہیں راستے کی کسی فیری میں ڈبو دیں تو یہ اتنا ہی اچھا ہوگا جس کے لئے کہتے ہیں۔

''خس کم جہاں پاک۔''

وہ چاروں ابھی تھوڑی دیر پہلے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں چائے پینے اور مغلئی پر اٹھا کھانے آئی تھیں۔جب صبیحہ کینٹین کے دروازے پر کسی کی بدرُوح کی مانند ظاہر ہوئی۔ طنزیہ نگاہوں سے اُنہیں دیکھتے ہوئے وہ عجیب سے کُھردرے انداز میں بولی۔

''اپنا اپنا سامان لے لو۔ گھنٹہ بھر سے تم لوگوں کی تلاش میں ٹانگیں توڑ رہی ہوں۔''

چائے میز پر آ چکی تھی۔ ثریا گرم گرم مغلئی پراٹھوں کی پلیٹ بھی لے آئی تھی۔ اُن کی سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں اُڑ رہی تھی۔ اُن کا بھوک سے بھی بُرا حال تھا پر یہ پکار ایسی تھی کہ وہ سب کچھ ویسے ہی چھوڑ چھاڑ کر بھاگیں۔ بھاگنے کی وجہ یہ تھی کہ اُن کا خیال تھا رحمان بھائی آئے ہیں۔

باہر سڑک پر سائیکل رکشا کھڑا تھا جو صبیحہ کے اشارہ کرنے پر اُن کے قریب آگیا۔ صبیحہ نے آگے بڑھ کر اُن کا سامان اُتروایا اور وہیں کوریڈور میں ڈھیر کروا دیا۔ سارا سامان اُتروانے کے بعد وہ اِسی سائیکل رکشے میں اُچک کر بیٹھی اور بغیر سلام دُعا یہ جا وہ جا۔

وہ چاروں ہونقوں کی طرح کھڑی کبھی سامان کو دیکھتی تھیں اور کبھی ایک دوسرے کو۔

اُس رات جب وہ ڈھاکہ واپس آرہے تھے۔ اُن کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ وہ اُن کا خریدا ہوا سامان لے کر خود یونیورسٹی آئے گا کیونکہ ساری خریداری اُن چاروں نے اکٹھے مل کر کی تھی اور سیر سپاٹوں میں علیحدہ کرنے کا وقت نہیں ملا تھا۔ اِن سبھوں کو اُس نے باری باری اُن کے گھروں پر اُتارا۔ اچھے الفاظ میں خدا حافظ کہا۔ جب ثریا اور نازلی اُتریں وہیں اُسے بھی اُترنا تھا۔ ہال جانے کا تو وقت نہ تھا۔

تب رَس ملائی کا وہ دونا جسے اُس نے کومیلا سے خریدا تھا۔ اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ثریا یہ آپ لوگوں کے لئے ہے۔''

نازلی اور ثریا دونوں باہر کھڑی تھیں اور وہ تھوڑا سا دروازہ کھولے باہر نکلنے کی

کوشش میں تھی جب اُس نے فرنٹ سیٹ سے رُخ پھیرا اُس کی طرف دیکھا اور بُہت دھیمے سے سر گوشی کے انداز میں بولا۔

''مجھی میرا جی چاہتا ہے تمھیں تو اپنے گھر لے جاؤں۔''

اُس کا دل دھڑ دھڑ کر اُٹھا۔ثریا اور نازلی کی ماں گیٹ پر آ گئی تھی اور اب دونوں لڑکیوں سے گلے مل رہی تھی۔

دو نا،کس نے پکڑا؟ثریا کی ماں نے اُس کی پیشانی پر پیار کرنے کے بعد اُس سے کیا پوچھا؟وہ گاڑی سے کیسے اُتری؟اور گیٹ تک کیسے پہنچی؟اُن کی ماں نے رحمان کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کیا اور رحمان بھائی نے اُن سے کیا باتیں کیں؟

اُسے کسی بات کا کچھ ہوش نہ تھا۔بس وہ ایسے چلی جیسے یہ خواب ہو۔

ساری رات گڑ بڑ ہوتی رہی۔کوئی دھیرے دھیرے اُسے کہتا رہا۔

''جی چاہتا ہے تمھیں تو اپنے گھر لے جاؤں۔''

دو تین دن بُہت عجیب سے گذرے۔دُھوپ اور پیڑوں کے پتوں کا رنگ بدلا بدلا سا نظر آیا۔شنا سا چیزیں بیگانی اور اجنبی سی لگیں۔

نازلی نے پوچھا۔''رحمان بھائی نہیں آئے۔''

''نہیں۔''

گہرے براؤن شیشوں والی سن گلاسز کے عقب سے اُس نے لانبی پلکوں کے سایوں میں جھلملاتی آنکھوں سے اُس پر سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے مختصراً کہا تھا۔

اور اِس بات کو بھی تین دن گذر گئے۔

اُس وقت وہ عجیب سی صورت سے دوچار تھیں۔سامان اُٹھا کر کچن میں لائیں۔ثریا نے پچھی اپنی زبان میں شاید صبیحہ کو گالی دی تھی۔نازلی کِھلکھلا کر ہنس

پڑی۔صفیہ اور اُس نے پُوچھا تھا۔نازلی نے کہا۔

''ارے تپی بیٹھی ہے۔غصہ نکال رہی ہے۔''

چائے ٹھنڈی ہوگئی تھی۔مغلئی پراٹھے اکڑے پڑے تھے۔کرسیوں پر بیٹھتے ہی اُنہوں نے قیاس آرائیاں شروع کردیں۔

''یوں لگتا ہے جیسے اِس نے وہ سب باتیں اُن سے کہہ دی ہوں۔''

ثریا نے کہا۔

''لگتا ہے کیوں کہتی ہوں؟ شک وشبہ والی بات تو رہی نہیں۔یقیناً کہو۔''

صفیہ نے چائے کا کپ اُٹھایا۔واقعہ یہ تھا۔

کپتائی کے ریسٹ ہاؤس میں اُن چاروں نے کورا کے متعلق خوب خوب باتیں کی تھیں۔اچھے خاصے اُس کے بخیئے اُدھیڑ ڈالے تھے۔چٹاگانگ کلب میں جس شب اُس نے ڈنر دیا۔اُس کی سب باتیں اور حرکتیں زیرِ بحث آئیں۔رحمان پر بھی تنقید ہوئی البتہ رحمان کے حُسنِ سلوک اور شریفانہ برتاؤ کی وجہ سے اُسے رعایتی نمبروں سے بھی نوازدیا گیا۔وہ تو سمجھی تھیں کہ آخری بیڈ پر لیٹی ہوئی صبیحہ گہری نیند سو رہی ہے۔کیونکہ اُس کے خراٹے خاصے جاندار تھے۔پر کچھ ہی دیر بعد جب اُس نے کروٹ بدل کر وقت پوچھا تو وہ سب دَھک سے رہ گئیں نازلی نے ثریا اور صفیہ کو ڈانٹا۔پر ثریا نے بے اعتنائی سے کہا۔

''مائی فُٹ۔''

چائے پی چکنے کے بعد اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ رحمان بھائی کو فون کریں اور صورتِ حال کی وضاحت کریں۔

سامان اُنہوں نے کنٹین والے کے سپرد کیا اور خود قریبی جناح ہال گئیں جہاں آٹومیٹک فون پر ثریا نے رحمان بھائی سے بات کی۔دیر تک باتیں ہوتی رہیں ثریا اپنی پوزیشن

واضح کرتی رہی۔ یہ نہیں کہا۔ وہ نہیں کیا وغیرہ قسم کے وضاحتی جُملے بار بار دُہرائے گئے۔ معلوم نہیں اُنہوں نے کیا پُوچھا؟ ثریا نے ہنس کر اُسے دیکھا اور کہا۔

''ہاں میرے پاس ہی کھڑی ہے۔''

ریسیور اُس کے کانوں سے لگا دیا۔ وہ ٹپٹا سی گئی۔ ہاتھ پاؤں پھُولنے لگے۔ گھور کر اُس نے ثریا کو دیکھا جیسے کہتی ہو۔

''یہ کیا بیہودگی ہے؟''

یوں یہ اور بات تھی کہ اُس کا دل اُس سے بات کرنے کو چاہتا تھا۔ ثریا نے ذرا غصّے سے کہا۔

''ارے بات کرو نا۔''

اُس نے کبھی کسی کو فون کیا ہوتا تو جانتی کہ اِسے کیسے استعمال کیا جاتا ہے؟ سخت نروس ہو رہی تھی۔ جی بھی چاہ رہا تھا کہ سُنے وہ کیا کہہ رہا ہے پر یہ خیال بھی کسی آسیب کی طرح اُس پر سوار ہو گیا تھا کہ کہیں اُس کا اناڑی پن نہ ظاہر ہو جائے۔

اُس نے ریسیور فوراً ثریا کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

''مجھے نہیں کرنی بات وات۔''

''اُف اللہ یہ صبیحہ ہے کیا چیز؟ اتنی ولگر عورت۔''

پھر اُس نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئی اپنے اور رحمان کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو اُنہیں سنائی۔

''معلوم ہوتا ہے اِسے بہُت پسند کرتے ہیں۔''

ثریا اُس کی طرف دیکھ کر ہنسی۔

''کہتے تھے بھئی سارا پروگرام تو اُس ویسٹ پاکستانی لڑکی کے لئے بنایا گیا تھا۔

مہمان جو ہوئی ہماری۔''

''بند کرو یہ بکواس۔'' اُس نے کتابیں سینے سے چمٹاتے ہوئے کہا۔

''بکواس بند نہیں۔'' صفیہ نے قہقہہ لگایا۔ بھئی تمہارے طفیل ہم نے مُفت میں سیر سپاٹا کیا۔

چٹا گانگ میں جب اُن لوگوں نے پیسے دینے چاہے تو اُس نے انکار کر دیا تھا۔

''صفیہ تم مجھ سے پٹو گی۔''

اُس کا چہرہ سُرخ تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی رو دے گی۔ نازلی نے پیار سے اُس کے رُخسار پر بوسہ دیا اور کہا۔

''یار تم خوامخواہ ناراض ہو رہی ہو۔ ہم لوگ تو مذاق کے موڈ میں ہیں۔''

پھر بُہت سارے دن گذر گئے۔ یہ بڑے عجیب اور ویران سے دن تھے۔ یوں جیسے اُداسیوں میں گھرے ہوئے ہوں۔

اُس شام جب دُھوپ پتہ بہار کے بوٹوں اور سبز گھاس کے قطعوں پر پھیلی اُداسی کا گھمبیر تاثر ہر سُو بکھیر رہی تھی۔ وہ بیلا ملکہ اور آصفہ کے ساتھ میرپور جانے کے لئے نیچے آئی تھی۔ فاخرہ کی بہن کی شادی تھی۔ بیلا، ملکہ اور آصفہ تینوں اُس کی روم میٹ تھیں۔ فاخرہ اُن کی دوست تھی۔ اُس کا آدھا دن اِس کمرے میں گذرتا تھا۔ شادی میں شرکت کا دعوت نامہ اُسے خصوصی طور پر دیا گیا تھا۔ اُس نے پہلی مرتبہ میک اَپ کیا تھا۔ گو یہ ہلکا ہلکا تھا۔ پہلی مرتبہ ساڑھی پہنی تھی۔ خوبصورت لڑکی کو اِس ذرا سے بناؤ سنگھار اور لباس نے قاتل بنا دیا تھا۔ ساڑھی اُس نے بیلا اور ملکہ کے پُرزور اصرار پر پہنی تھی۔ بلکہ ساڑھی بھی بیلا کی تھی۔ اُس نے بُہت کہا۔

''بیلا مجھے عادت نہیں۔ کہیں کھُل کھلا گئی تو اور لینے کے دینے پڑ جائینگے۔

بیلا نے اُس کے سر پر چپت لگائی اور ٹھنک کر بولی ۔

''کیوں کھُل کھلا جائے گی تو کیا خوق (بچی) ہے؟ ۔ ہاں دیکھو تو ذرا کیسی سُندر رلگ رہی ہو۔اگر میں کہیں لڑکا ہوتی تو تجھے اُڑا کر لے جاتی ۔''

آصفہ نے بھی بُہت سراہا۔

''نجمی تم بُہت حسین لڑکی ہو۔شاید تمہیں اپنے حُسن کا احساس نہیں ۔معمولی سے میک اَپ، اِس لباس اور بالوں کے اِس سٹائل نے تمہیں کتنا جاذب نظر بنادیا ہے کہ آنکھ کا تم پر سے اُٹھنا مشکل ہو رہا ہے ۔''

اُس کے شانوں پر جھولنے والے بالوں کا آصفہ نے بڑا خوبصورت جوڑا بنا دیا تھا۔

میر پور جانے کے لئے جب وہ نیچے آئیں ۔آڈیٹوریم میں سے گذرتے ہوئے اُسے دربان ملا جس نے کہا۔

''آپا آپ سے ملنے کوئی صاحب آئے ہیں ۔''

''مجھ سے ۔'' اُس نے قدرے حیرت سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

''ہاں ہاں آپ سے ۔''

دربان نے اُس کے سامنے اُس کا نام دُہرا کر اُس کی تسلی کر دی تھی ۔وہ رُک گئی ۔اُس وقت لڑکیاں آڈیٹوریم کے چکنے فرش پر اسکیٹنگ کر رہی تھیں ۔بظاہر اُنہیں دیکھتے ہوئے دل کی دھڑکنوں کو قابو کرنے کے جتن میں مصروف ہوئی ۔

''پلیز ذرا ٹھہرو میں دیکھ کر آتی ہوں کون آئے ہیں؟''

کہتے ہوئے وہ گیٹ کی طرف بڑھی ۔

اُس وقت وہ عجیب سی کیفیت سے گذر رہی تھی ۔دل جیسے ڈوبا ہوا محسوس ہونے

لگا۔ ٹانگیں بے جان جیسے گوشت کا ایک ایسا لوتھڑا جسے بمشکل گھٹیا جا رہا ہو۔

''کون ہوسکتا ہے؟''

گیٹ تک پہنچتے پہنچتے اُس نے کوئی دس بار یہ سوال اپنے آپ سے کیا تھا۔ حالانکہ یہ سوال فضول تھا۔

اُس کا دل جو جواب دے رہا تھا وہ اپنے اندر ٹھوس یقین لئے ہوئے تھا۔

گیٹ سے نکلی تو ساری جان سے کانپی تھی۔ آنکھوں میں خوف سا اُبھرا تھا یہ اور بات ہے کہ خوف کے ساتھ ساتھ وہاں چمک بھی پیدا ہوئی تھی۔

نیلی مزدہ میں وہ بیٹھا گیٹ ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ آگے بڑھی۔ جھکی۔ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے اُس نے سلام کیا۔ اُس نے دیکھا تھا وہ ایک ٹک اُسے دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں میں حیرت، شوق اور استعجاب کا ایک جہان لئے۔ گھبراہٹ اور سوار ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد خیریت دریافت کی گئی۔ اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور جیسے کنوئیں کے پاتال سے کہا ہو۔

''ٹھیک ہوں۔''

وہ ہنسا اور اُس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''کہاں ٹھیک ہو؟ گاڑی میں بیٹھو اور شیشے میں اپنا آپ دیکھو۔ پھر مجھے بتاؤ کہ ٹھیک ہو یا نہیں۔ تمہارے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔''

وہ پھر ہنسا۔ یہ ہنسی بڑی مدھم اور شفقت سے لبریز تھی کیونکہ اُس نے جس انداز میں رحمان کو دیکھا تھا اُس میں عجیب سی بے بسی کا اظہار تھا۔

''کہیں جا رہی ہو؟''

''جی۔میرپورایک دوست کی بہن کی شادی ہے۔''

''تو آؤ!تمہیں ڈراپ کر آؤں۔''

''میرے ساتھ میری چند دوست بھی ہیں۔''

''تو کیا ہوا۔جاؤ اُنہیں بُلا لاؤ۔''

وہ مُڑی اور تیز چال چلتی چھوٹے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔

اُس کا ذہن ابھی کچا تھا۔نہ اُس نے دُنیا دیکھی تھی اور نہ اُس کے چھلوں سے واقف تھی۔اُنیس سالہ لڑکی اُس سے بُہت متاثر ہو چکی تھی۔اُس کے اُونچے عہدے،لمبی گاڑی،امیر خاندان سے تعلق،وجاہت اور شائستہ اطوار سبھوں نے اُسے اپیل کیا تھا۔

بیلا نے اُسے دیکھتے ہی پُوچھا۔

''کون ہے؟ ملاقاتی گاڑی واڑی والا ہے یا یونہی سائیکل سوار۔لفٹ ملنے کا امکان ہے یا نہیں؟''

''تم بھی کیا یاد کرو گی بیلا۔چلو خوش ہو جاؤ۔گاڑی سے میرپور چلیں گے۔''

ایک دوسری کے آگے پیچھے چلتی وہ گیٹ سے باہر آئیں۔

گاڑی میں پچھلی نشست پر جب وہ اُن کے ساتھ ہی پھنس پھنسا کر بیٹھنے لگی تو اُس نے ڈپٹ کر کہا۔

''سٹوپڈ۔آگے آؤ۔آرام سے بیٹھنے دو اُنہیں۔''

لہجے کے اِس تحکمانہ انداز میں ایک اپنایت بھی تھی جو اُس سے چھپی نہ رہی تھی۔

پیچھے سے اگلی سیٹ تک جانے کے وقفے میں اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔اُس کی باریک بین نگاہوں نے اُس کی دلی کیفیات کو سمجھا۔اُس کے لباس سے اُٹھتی چارلی کی خوشبو کو سونگھا۔سگریٹ جلایا۔لمبا کش لے کر دُھواں باہر پھینکا اور گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے

سرگوشی میں بولا۔

''تم اتنی نروس کیوں ہورہی ہو؟''

فاخرہ کے گھر وہ صرف ایک بار ہی آئی تھی۔میر پور کے انجانے راستے ایک بار میں کہاں پہچانے جاتے۔ بیلا دو تین بار آچکی تھی۔وہ بھی بھولی بیٹھی تھی۔گاڑی سڑکوں کے موڑ کاٹتی پھررہی تھی۔ٹامک ٹوئیاں مارنے والی بات تھی۔

ملکہ نے کچھ سُنی سُنائی نشان دہی کی۔کچھ اُس نے دماغ لڑایا اور یوں شادی والے گھر پہنچ گئیں۔

اور قناتوں والے گھر کے سامنے کھڑے اُن سب لڑکیوں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔وہ تینوں آگے بڑھ گئیں۔اُس نے قدم اُٹھانے سے پہلے رُخ پھیر کر دیکھا۔جب وہ بولا۔

''میں پیر کی شام کو آؤں گا۔کہیں جانا مت۔''

کوئی جواب دینے کی بجائے اُس نے خاموشی سے سر جھکا لیا اور آہستہ آہستہ شادی والے گھر کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

باب نمبر ۱۴:

''ٹھیک سے بیٹھو۔گھبرا کیوں رہی ہو؟ اور رہاں شیشہ نیچے کرو۔تمہیں ٹھنڈی ہوا لگے۔''

اُس نے شیشہ آہستہ آہستہ نیچے کیا۔اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔سختی سے بھینچے ہونٹ یوں بند تھے جیسے کبھی نہیں کُھلیں گے۔

شاندار گاڑی میں یوں تمکنت سے بیٹھنا بلا شبہ بہت دل خوش کن تھا۔ہمیشہ ہی حسرت سے اُن عورتوں کو دیکھا کرتی تھی۔جو کاروں میں بیٹھی بے نیازی سے فٹ پاتھوں پر چلتی پھرتی عورتوں پر اِک نگاہ غلط انداز ڈالتیں یوں جیسے وہ دھرتی کے کیڑے مکوڑے ہوں، اور پھر شانِ بے نیازی سے سکرین سے پرے دیکھنے لگتیں۔

آج وہ بھی ایک خوبصورت گاڑی میں بیٹھی تھی۔ پر دل جیسے من من بھر کے پتھروں کے نیچے آیا ہوا تھا۔وہ چاہتی تھی کہ کار کا دروازہ کُھلے اور وہ نکل بھاگے۔خود کھول کر باہر نکلنے کا حوصلہ نہیں تھا۔وہ کبھی اکیلی کسی اجنبی مرد کے ساتھ نہیں بیٹھی تھی۔یوں یہ وجیہہ سا آدمی جو اپنے اندر اپنائیت لئے ہوئے تھا اب اتنا اجنبی بھی نہ رہا تھا۔اُنہوں نے اُس کے ساتھ پانچ دن گذارے تھے۔اُس نے ایک اچھے دوست کی طرح حق رفاقت ادا کیا تھا۔ ایک اچھے محافظ کی طرح اُن کی حفاظت کی تھی اور ایک اچھے انسان کی طرح پسندیدہ عادات کا مظاہرہ کیا تھا۔

جانے یہ کون سی سڑکیں تھیں۔گاڑی بڑی تیزی سے اُن پر دوڑ رہی تھی۔یہاں اتنی گہما گہمی تو نہیں تھی۔پر ویرانی بھی نہ تھی۔اِکّا دُکّا راہگیروں کا سلسلہ مسلسل جاری تھا۔
وہ سکون سے گاڑی چلا رہا تھا۔گردن موڑ کر ایک بار بھی اُس نے اپنے قریب

بیٹھی ہوئی اُس لڑکی کو نہیں دیکھا تھا جو خوفزدہ اور ہراساں سی گُم سُم اپنے آپ میں کھوئی کھوئی تھی۔

یوں یہ اور بات تھی کہ وہ دیکھے بنا ہی اُس کے دل کا حال رتّی رتّی جانتا تھا۔

تاریکی چھا گئی تھی۔سڑکوں کی ٹمٹاتی روشنیوں میں رات کچھ زیادہ ہی اندھیری لگ رہی تھی۔ایک بڑی دکان کے سامنے گاڑی رُکی۔یہ کوئی سُپر سٹور تھا۔اُس نے ہارن دیا۔ویٹر آیا۔

اُس نے رُخ پھیرا اور پوچھا۔

''کیا کھاؤ گی؟''

''کچھ نہیں۔''

کچھ نہیں جب اُس کی زبان سے نکلا تھا یہ آواز اُس جان بلب مریض کی سی تھی۔ جو وقت نزع بمشکل ایک دو لفظ منہ سے نکالتا ہے۔

اُس کے ہونٹوں پر ہنسی دوڑ گئی۔ویٹر کو آئس کریم کا آرڈر دے کر اپنا بازو اُس نے بیک پر پھیلایا۔دروازے سے ٹیک لگاتے ہوئے اُس نے بائیں ٹانگ سیدھی کی۔اندر کی روشنی بُجھی ہوئی تھی پر باہر سے آتی مدھم سی روشنی میں وہ اُسے دیکھ سکتا تھا۔اُس کا دل چاہا تھا کہ وہ سہمی سہمی اُس لڑکی کو اپنے سینے سے لگا کر پُوچھے کہ وہ اتنی خوف زدہ کیوں ہے؟

''میں سگریٹ جلا سکتا ہوں؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔اُس کی آنکھوں میں ایسی بے بسی تھی جسے محسوس کرتے ہی اُسے تھوڑی سی کوفت کا احساس ہوا۔سگریٹ جلا کر وہ نرمی سے بولا۔

''مجھی میں حیران ہوں۔آخر تم اِس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں تمہیں جبراً اغوا کر کے لایا ہوں۔جب سے گاڑی میں بیٹھی ہو جیسے قسم کھائی ہے

کہ بولنا نہیں، بات نہیں کرنی۔ دیکھو مجھ سے گھبرانے، ڈرنے یا خوف زدہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ تم مجھے اپنا ایک مخلص اور اچھا دوست پاؤ گی۔ تمہاری حفاظت میرا فرض ہے اِس لئے کہ میں بھی ایک عدد بیٹی کا باپ ہوں۔ میری ازدواجی زندگی پُرسکون ہے۔ جنسی لحاظ سے بھی میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں۔ ہاں پلیز اِس طرح سکڑ سکڑ کر مت بیٹھو۔ مجھے یہ احساس نہ دلاؤ کہ میں نے تمہیں یہاں لا کر کوئی غلطی کی ہے۔ تم ایک اچھی لڑکی ہو، مجھے پسند آئی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تم اپنا وقت میرے ساتھ اچھی اچھی باتیں کرنے، قہقہے لگانے اور خوش گپیوں میں گذارو۔ ہاں میری دوست بنو گی؟ بولو کیا کہتی ہو؟''

تبھی آئس کریم آ گئی۔ اُس نے کپ پکڑے۔ ایک اُس کی طرف بڑھایا، دوسرا خود پکڑا اور بولا۔

''چلو اِن باتوں کو فی الحال چھوڑو۔ اِسے کھاؤ۔''

ہچکچاتے ہوئے اُس نے کپ پکڑا۔ عجیب سے احساس اور نا قابلِ فہم دُکھ نے جکڑا ہوا تھا۔

لذیذ آئس کریم کھاتے ہوئے وہ اپنے آپ سے بولا تھا۔

من اوبھ گیا تھا۔ سوسائٹی گرلز سے۔ اب پہلو میں بیٹھی یہ گھبرائی گھبرائی اور خوفزدہ سی لڑکی کس قدر اچھی لگ رہی ہے۔ لگتا ہے کہ مصور نے جیسے ایک ہراساں سی دوشیزہ کا شاہکار بنا کر سیٹ پر بٹھا دیا ہے۔ زندگی لاکھ دُکھوں اور تلخیوں سے بھری ہوئی ہو پر اُس کے کچھ لمحات اتنے سُندر ہیں کہ انسان بے اختیار جینے کی تمنا کرتا ہے۔

اپنی آئس کریم کھا چکنے کے بعد اُس نے دیکھا وہ ایسے ہی کپ ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہے۔

''ارے ارے کھاؤ نا۔ کیا اچھی نہیں؟''

وہ بمشکل بولی۔ ''میں کھا رہی ہوں تھوڑا آہستہ کھاتی ہوں۔''

''اچھا چلو مجھے یہ بتاؤ تمہیں ڈھاکہ اور اُس کے لوگ کیسے لگے؟''

اُس نے دوسرا سگریٹ جلایا۔ ماچس کی تیلی باہر پھینکی۔ گاڑی سٹارٹ کرنے کے لئے چابی گھمائی اور گیئر بدلتے ہوئے کہا۔

''کھل کر بتاؤ۔''

اور اُس نے سنجیدگی سے باہر تاریکی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جگہیں تو اچھی ہوتی ہیں پر بات تو مکینوں کی ہے۔ ڈھاکہ سبزے میں لپٹا ہوا طراوت اور تازگی کا احساس بخشتا ہوا اچھا لگتا ہے۔ لوگ انفرادی سطح پر اچھے ہیں مخلص اور محبت کرنے والے ہیں۔ اجتماعی حیثیت میں متعصب ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ زہریلے پروپیگنڈے کے ہاتھوں مجبور ہو گئے ہیں۔ سیاسی سرگرمیاں صحت مند نہیں۔ وہ اتنی خطرناک ہیں کہ وطن کا یہ حصّہ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اپنے طور پر میں کہہ سکتی ہوں کہ یہاں آ کر میں "وطن کیا ہوتا ہے؟ اُسکی محبت کیسی ہوتی ہے؟ جیسے خوبصورت اور لطیف احساسات سے دوچار ہوئی ہوں۔ ویسٹ پاکستان میں رہتے ہوئے ایسے جذبات کا کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ یہاں وطنیت کی محبت والے سوتے اُبل پڑے ہیں۔

وہ گاڑی چلاتا رہا۔ اُسے سنتا رہا۔ گاڑی ڈھاکہ کی ویران سڑکوں پر گھومتی رہی۔۔ جب وہ خاموش ہوئی اُس نے کہا۔

''تم بہت اچھا بولتی ہو۔ کالج میں مباحثوں میں حصّہ لیتی رہی ہو شاید۔''

کچھ دیر بعد اُس نے وقت پوچھا اور آٹھ بج رہے ہیں جان کر وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ساڑھے آٹھ بجے گیٹ بند ہو جاتا ہے۔ آپ مجھے اب ڈراپ کر دیجیے۔''

مہندی کی باڑ کے پاس رُک کر اُس نے خوف زدہ نظروں سے پہلے پروفیسر کے گھر کو دیکھا۔ لائٹس جل رہی تھیں۔ پر کوئی تھا نہیں۔ آڈیٹوریم بھی تقریباً خالی ہی تھا۔ ساری لڑکیاں ڈائننگ ہال میں جمع تھیں۔ بس کوئی اِکّا دُکّا گھومتی پھرتی نظر آ رہی تھی۔

''کیا سوچتی ہوں گی میری رُوم میٹز کہ میں کہاں چلی گئی ہوں؟''

اپنے کمرے میں جانے کی بجائے وہ ٹیبل ٹینس کی میز پر نیم دراز ہو گئی۔ دودھیا روشنی وسیع وعریض آڈیٹوریم میں اُداسی کا گہرا تاثر پھیلا رہی تھی۔ دل بڑا بوجھل بوجھل سا تھا۔ کھانے کو بھی ذرا جی نہیں چاہ رہا تھا۔

''میں کل پھر آؤں گا۔''

جب وہ گاڑی سے اُتر رہی تھی اُس کا ایک پاؤں زمین پر اور دوسرا گاڑی میں تھا۔ ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر تھا اور ادھ کھلے دروازے سے بس وہ باہر نکلنا چاہتی تھی جب اُس نے یہ بات سُن کر زخمی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

اور پھر بغیر کوئی جواب دیئے وہ گیٹ کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ آئی تھی۔ اور یہاں میز پر نیم دراز اُس کے اندر اور باہر زور و شور کی جنگ ہوئی۔ اندر والے نے خوب خوب طعنے مارے۔ پڑھے ہوئے ناولوں، افسانوں اور قصے کہانیوں نے مرد کی رنگینی طبع کو خوب خوب اُچھالا۔

''کیا واسطہ ہے اُس کا تمہارے ساتھ جو وہ اِس مہنگے سے یوں تم پر پٹرول اور پیسہ ضائع کرتا ہے۔''

اُس نے اُس کی شرافت اور حُسنِ اخلاق پر دلائل دیئے۔ چٹا گانگ کا حوالہ دیتے ہوئے اُس کے اعلیٰ کردار اور ملنساری پر کچھ کہنا چاہا پر زناٹے کا ایک وار پڑا۔

''جال پھینک رہا ہے پھنس جاؤ گی تو ڈوری یوں کھینچے گا کہ گلا گھٹ جائے گا اور

آنکھیں اُبل پڑیں گی۔''

ایسی ایسی خوفناک تصویریں اُس کے سامنے آئیں کہ وہ تڑپ اُٹھی۔

''آگ سے جو بھی کھیلا اُس نے سدا ہاتھ ہی جلائے۔وہ بُلبلیں جو بازوں کے ساتھ اُونچی اُڑان لینے کی کوشش کرتی ہیں ہمیشہ زمین پر گر کر مرتی ہیں۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ دریا میں چھلانگ ماری جائے اور جسم سُوکھا رہے۔

پتہ نہیں دل کے کن کونے کھدروں سے یہ آوازیں اُٹھ رہی تھیں۔طعن وتشنیع کا ایسا کھر پہ چلا جس نے سب کچھ لہولہان کر ڈالا۔ایک تو وہ پہلے ہی پریشان تھی اِس پر ستم یہ چرکے۔وہ بلبلا اُٹھی یوں لگا جیسے سارا اندر بوٹیوں میں کٹ گیا ہو۔

''بھاڑ میں جائے سب کچھ۔مجھے اپنا ذہنی سکون نہیں تباہ کرنا۔''

اُس کے حلق میں کانٹے چبھنے لگے تھے۔دل بیٹھا جا رہا تھا۔

''ہائے اللہ کہیں سے ٹھنڈا یخ پانی مل جائے۔کیسی آگ لگ گئی ہے اندر۔''

پر ٹھنڈا پانی کہاں سے ملتا۔اِس حال میں فریج جیسی قیمتی اشیاء کی عیاشی ممکن نہ تھی۔

باب نمبر ۱۵:

کیسی طوفانی بارش تھی ۔لگتا تھا جیسے آسمان کے سینے میں چھید ہو گئے ہوں ۔گھلے ہوئے بادلوں میں سارا ماحول دُھواں دُھواں ساہو رہا تھا۔ہوا کے تیز تھپیڑے کسی پاگل جنونی کی طرح جو بپھرا ہوا اپنے شکار کا تیا پانچہ کرنے پر تُلا ہو گاڑی پر وار پر وار کر رہے تھے ۔وائپرز ونڈسکرین کی صفائی میں دیوانوں کی طرح چکر کاٹ رہے تھے ۔

دل میں ہلچل مچانے والا خوبصورت موسم ، رائل بلیو ٹیوٹا اور اُسے ڈرائیور کرتا ڈیشنگ قسم کا مرد ۔

''میں اگر یہ کہوں کہ تم اُس دن قصداً نہیں آئیں تو یقیناً غلط نہ ہو گا ۔''

ساور جانے والی اِس سڑک پر گاڑی اُس نے ایک طرف روکی ۔سٹیرنگ پر جھکے جھکے سگریٹ جلائی ۔لمبا سا کش لیا اور سکون سے اُسے دیکھا جو کہہ رہی تھی ۔

''میری طبیعت ٹھیک نہ تھی ۔''

''اپنی اُن سوچوں کے بارے میں مجھے کچھ بتاؤ گی؟ جنہوں نے تمہاری طبیعت ٹھیک نہ رہنے دی ۔''

''آپ قیاس آرائیوں میں بہت ماہر معلوم ہوتے ہیں ۔''

وہ مُسکرایا ۔سگریٹ کا لمبا کش کھینچتے ہوئے بولا ۔

''غلط بات کرتی ہو اور وہ بھی مجھ سے ۔''

وہ تھوڑا جز بز ضرور ہوئی ۔پر خاموش رہی ۔سمجھ گئی تھی کہ تردید کے لئے جو کچھ بھی کہے گی اُس میں جان نہیں ہو گی اور وہ اُسے یقین کی چھُری سے کاٹ پھینکے گا ۔گاڑی میں خاموشی تھی ۔باہر بارش برسنے کی نغمگی تھی ۔سگریٹ کا دھواں تھا جسے وہ تھوڑا سا شیشہ کھول

کرتھوڑی تھوڑی دیر بعد باہر نکال دیتا۔

دیر بعد اُس نے نگاہیں اُس کے ملیح چہرے پر جمائیں اور خفیف سا مسکراتے ہوئے بولا۔

''اگر میں تمہیں وہ سارے خدشات بتا دوں جو تمہارے دل ودماغ پر یورش کرتے رہے ہیں تب کیا کہوگی؟''

اُسے تو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اپنی مدافعت میں بولے تو کیا بولے؟ وہاں تو قیاسوں اور اندازوں کی بات نہیں تھی۔ دعوے تھے اور ہر دعوے کے تعاقب میں پختہ یقین کا اعلان تھا۔ اِس لئے وہ سر جھکائے گلابی ڈوپٹے کے پلو کو اُنگلیوں پر لپیٹتی اور کھولتی رہی۔ فضول بہانہ تراشیوں کا قطعی کوئی فائدہ نہ تھا۔

اُس نے اندر کی لائٹ جلائی۔ اُس کے سُرخی مائل سیاہ بال گلابی پھولدار قمیص پر بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کا خوبصورت چہرہ کسی حد تک اُن کے سائے میں چھپا ہوا تھا۔ سفید نازک لابنی اُنگلیوں والے ہاتھ جن کے ناخن قمیص کے ہمرنگ پالش میں ڈوبے ہوئے ڈوپٹے کے کونے سے کھیل رہے تھے۔

فوراً اُس نے بتی بُجھا دی تھی۔

''مجھے بلند بانگ دعوؤں سے سخت نفرت ہے۔ دوبارہ پہلے کہہ چکا ہوں تیسری بار پھر بتا دینا چاہتا ہوں کہ مجھے تمہارے اندر دوڑتے نیک اور شریف خون کا پورا احساس ہے۔ تمہیں میرے اُوپر اعتماد کرنا چاہیے۔''

اُس کے لب ولہجے میں جو یقین اور اعتماد تھا۔ اُس کا ڈوبتا اُبھرتا دل لمحہ بھر کے لئے سکون پا گیا۔

لیکن شک نے پھر سر اُٹھایا۔ وہ جو کتابوں میں اتنا کچھ لکھا ہوا ہے ایسی لمبی چوڑی

کہانیاں، مرد کی ذات نا قابل اعتماد اور دغا دینے والی۔ کیا سب غلط ہے؟

''ہاں غلط بھی ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی ضروری تھوڑی ہے کہ لکھنے والوں کے تاثرات پرکھ اور تجربے کی کسوٹی پر پورے اُترتے ہوں۔ دُنیا رنگا رنگ انسانوں سے بھری پڑی ہے۔ نیک بد۔ اچھے بُرے ہر طرح کے لوگ۔ طبیعتوں، مزاجوں، عادات و خصائل میں مختلف۔ سب کو ایک لاٹھی سے کیسے ہانکا جا سکتا ہے؟''

یہ جوابی اعتراض اُس کے دل نے دیا تھا اور یہ اتنا قوی تھا کہ اِس بار دماغ خاموش رہا۔

اُس نے باہر دیکھا۔ بارش رُک گئی تھی۔

نمی میں ڈوبی بوجھل ہوائیں سارے میں دوڑتی پھر رہی تھیں جہاں لطیف سی ٹھنڈک کا احساس رَگ و پے میں اُتر کر لمحات کو بُہت خوشگوار بنا رہا تھا۔ وہیں سڑک کے اطراف میں اُگی گھنی جھاڑیاں، درخت، اندھیرا، سب نے مل جل کر فضا کو بُہت پُراسرار اور ڈراؤنا سا بنا دیا تھا۔

دفعتاً اُس نے سکرین پر جمی نگاہیں اُٹھائیں اور اُسے دیکھا۔ وہ سموکنگ میں یوں مگن تھا جیسے دُنیا میں اِس سے بڑا کوئی اور کام ہی نہ ہو۔

پل بھر وہ اُسے غور سے دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے رُخ پھیرا۔ اپنے سر کو بیک سے ٹکاتے ہوئے لمبی سانس بھری اور اپنے آپ سے یوں گویا ہوئی جیسے اپنے اُوپر بیتی بپتا اپنے آپ کو سُنا کر خود کو ہلکا کرنا چاہتی ہو۔

''اللہ یہ دن تو یوں لگتے تھے جیسے میں نے پھانسی کے تختے پر گذارے ہوں۔''

دماغ جیسے پھوڑا بن گیا تھا کہ جس میں سے اُٹھتی ٹیسیں بے کل کرتی تھیں۔ یہ ٹھیک تھا کہ یہ شاندار سی کار، اُس میں بیٹھا باوقار سا مرد جس کا تعلق ہائی جنریٹری سے ہے،

اُسے بہت اچھے لگے تھے۔چاہے جانے کی تمنا کسے نہیں ہوتی۔اُسے بھی یہ خواہش تھی کہ کوئی اُسے پسند کرے۔چاہے۔پر اب وہ اتنی بھی احمق نہ تھی۔مانا کہ اُس نے دُنیا نہیں دیکھی تھی۔ایک قدیم او ر دقیانوسی روایات والے گھر میں پرورش پائی تھی۔جہاں فلمیں دیکھنی معیوب تھیں۔گانے سُننے بُرے تھے۔بے محابا نہ پھرنا ناپسندیدہ تھا۔پر پھر بھی وہ کالج پڑھنے جاتی تھی۔چوٹی کے کالج میں جہاں ہر دن وہ ایک نیا اسکینڈل سُنتی۔فلاں کا آفیئر فلاں سے چل رہا ہے۔فلاں فلاں سے فلرٹ کر رہی ہے۔لمبی لمبی گاڑیاں آتیں اور لڑکیوں کو پک کر کے چلی جاتیں عین اسی طرح جیسی آج اور دو دن پہلے اُسے کسی نے پک کیا تھا۔کالج بس سٹاپ پر کھڑی لڑکیاں اُن کے بخیئے اُدھیڑنے پر ہی اکتفا نہ کرتیں بلکہ کھال تک نوچ ڈالتیں۔اگلی پچھلی سات پشتوں تک تبصرہ آرائی ہوتی۔

ایسے میں یہ سوال بار بار سامنے آتا۔

''کیا یہ شخص بھی فلرٹ کرنا چاہتا ہے؟''

اُن اضطرابی دنوں میں اِس سوال کے بار بار سامنے آنے پر اندر با ہر جنگ وجدل کا بازار گرم رہا۔سوچوں کی گھمسن گھیریوں اور کھولاؤ نے دماغ کی چُولیں ڈھیلی کر دی تھیں۔ لگتا تھا اُس کا سارا وجود آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑا ہے کہ بس ایک ہی لمحے میں سب کچھ پھٹ پھٹا جائے گا۔مختلف اوقات میں متضاد کیفیات کے رُخ سامنے آتے۔کبھی وہ اُسے اپنا سا لگتا۔اُس کے بارے میں ذرا سی گھٹیا سوچ یا خیال اُسے بے چین کر دیتا۔

رات کو سوتی تو جیسے کوئی کہتا۔

''ارے تم دُھت سو رہی تھیں۔رحمان بھائی تم پر اپنا کمبل ڈال گئے۔موسم اتنا ٹھنڈا ہو گیا تھا نا۔''

''میں تو اِس لڑکی کے لئے چٹا گانگ گیا تھا۔مہمان جو ہوئی ہماری۔''

''جی چاہتا ہے تمہیں اپنے گھر لے جاؤں۔''

ایک آدھ بار اُس نے یہ بھی سوچا کہ آخر اتنی لڑکیوں کے درمیان اُس نے اُسے ہی دوست بنانے کے لئے کیوں پسند کیا؟ پر اِس سوال کا جواب بھی مشکل نہ لگتا۔ آئینے کی طرح ہر چیز سامنے تھی۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ قیمتی کپڑے پہنتی تھی۔ اپنے آپ کو اُونچے گھر کی لڑکی ثابت کرتی تھی۔

شانوں پر جھولتے بالوں، خوش رنگ لباس اور ہلکے ہلکے میک اپ کے ساتھ جب وہ اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتی تو میٹھی سی مُسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر خود بخود بکھر جاتی اور وہ اپنے آپ سے کہتی۔

''تو یہ میں ہوں۔ اللہ۔ میں تو خود اپنی پہچان میں نہیں آ رہی ہوں۔''

ایسے لمحوں میں وہ یکسر بھول جاتی کہ اُس کا باپ تین سو روپلی کے لئے گذشتہ دو سالوں سے آزاد کشمیر کی سنگلاخ چٹانوں میں پھنسا ہوا ہے۔ اُس کی ماں میلے کپڑوں میں لپٹی لکڑیوں کے کڑوے کسیلے دھوئیں سے اُلجھ رہی ہوگی۔ اُس کے چھوٹے بھائی پیسوں کے لئے ماں سے جھگڑ رہے ہوں گے۔

آئینے میں جو عکس اُسے نظر آتا یہ اُس کے خوابوں کی تعبیر تھا۔

یوں ذہن کو اُلجھانے میں ایک اور بات بھی بڑی نمایاں تھی اور وہ اُس کا شادی شدہ ہونا تھا۔ جب وہ یہ سوچتی کہ گھر میں اُس کی بیوی ہے جو یقیناً خوبصورت بھی ہوگی۔ اُسی کی طرح بنگال کے امیر کبیر خاندان سے ناطہ ہوگا۔ خود اُس کی باتوں سے ظاہر ہے کہ اُن کے درمیان اچھے خوشگوار تعلقات ہیں۔ بچے بھی ہیں۔ تو پھر اُسے کیا مصیبت پڑی ہے کہ یہ پرائی لڑکیوں سے دوستیاں کرتا پھرے؟ اِسے ہوس کا نام ہی دیا جا سکتا ہے۔

یہ ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ معصوم سی لڑکی پھر پٹڑی سے اُتر کر سوچوں کے گرداب

میں پھنس گئی۔احمق اور جذباتی لڑکی نے گردن اُٹھا کر اُسے دیکھا۔

اور وہ اُس کی چہرے کے اُتار چڑھاؤ پڑھنے میں مصروف تھا۔نگاہوں کا ٹکراؤ۔ شربتی چمکدار آنکھیں اور ذہین روشن کالی آنکھوں کا تصادم۔

سٹپٹا کر اُس نے سر جھکا لیا۔

تب اُس گھمبیر سناٹے میں اُس کی نرمی اور محبت کی پھوار میں بھیگی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''ذہن کو اتنا مت اُلجھاؤ۔آؤ واپس چلیں۔''

''اللہ یہ کس قدر زیرک ہے۔میرے دل کا حال کیسے جان لیتا ہے؟میرے دماغ کو کیسے پڑھ لیتا ہے؟کیا اُس کے پاس کوئی آلہ ہے۔ایک میں پاگل بیوقوف کہ تین دنوں سے بلکہ اگر یہ کہوں کہ جب سے چٹا گانگ سے آئی ہوں ذہنی طور پر بیمار ہوگئی ہوں۔ ہر گاڑی رائل بلیو ٹیوٹا نظر آتی ہے اور اندر بیٹھے ہر مرد پر اسی کا گمان پڑتا ہے۔''

باب نمبر ١٦:

ایسا ٹائٹ شیڈول تھا کہ جس نے دو دنوں کے گھنٹوں اور منٹوں کو جکڑ کر رکھ دیا تھا۔ ذرا دم لینے کی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ بہتیرا چاہا کہ تھوڑی سی گنجائش کسی نہ کسی طرح نکل آئے۔ مصروفیت کے اژدہام میں سے چند لمحے ہی میسّر آجائیں۔ وقت کی تنی طنابیں ذرا سی ڈھیلی ہو کر اُسے راہِ فرار دے دیں۔ وہ بھاگم بھاگ رُقیہ ہال کا ایک چکر لگا آئے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نہ وقت مرضی کے تابع رہتا ہے اور نہ صورتِ حال۔ وہ ایسی ہی کٹھن گھیریوں میں پھنس گیا تھا۔ یہ خیال اُس کے لئے پریشان کُن تھا کہ پاگل احمق لڑکی سوچوں کے بھنور میں پھنسی اُن سے لڑتی اُلجھتی ہلکان ہو گئی ہو گی۔ پر وہ اپنی بہترین کوشش کے باوجود کچھ نہیں کر پا رہا تھا جو وہ چاہتا تھا۔ کام یوں پیر پسارے بیٹھا تھا کہ کسی طرح سمٹنے میں نہ آرہا تھا۔

مغربی پاکستان سے دس انجینئر ز اور برطانیہ سے دو آرکیٹیکٹ آئے ہوئے تھے۔ ہیڈ آفس کی نئی عمارت کا پروجیکٹ موتی جھیل کمرشل ایریا میں تعمیر کے لئے زیرِ غور تھا۔ کل سے اب تک کوئی دس میٹنگز Meetings ہو چکی تھیں۔ ابھی گھنٹہ بعد پھر منسٹر کے پاس حاضری تھی۔ رات کوئی دو بجے تک اُن میں مصروف رہا اور آج بھی فراغت کی اُمید نہ تھی۔

خیال آیا کہ اُس کے ڈپارٹمنٹ فون کر کے ہی اُسے کچھ کہے۔ چلو تھوڑی سی دل جوئی تو ہو گی۔ فزکس ڈپارٹمنٹ کا نمبر ملانے کے لئے اُس نے آپریٹر سے بات کی۔ ابھی بات جاری تھی جب بادل کمرے میں داخل ہوا۔ بادل سے دوستی ضرور تھی پر اتنی گہری بھی نہ تھی۔

''بھئی ایک ضروری پیغام دینا ہے جیسے بھی ہو اِس لڑکی سے بات کرواؤ۔''

''کوئی نیا شکار پھانسا ہے؟''بادل نے ہنستے ہوئے پیپر ویٹ ہاتھوں میں پکڑا۔

''تمہیں میں شکاری نظر آتا ہوں؟'' اُس کا انداز طنز سے کہیں زیادہ افسوسناک تاثر کا حامل تھا۔

''کچھ کچھ تو ہو۔'' بادل کی مسکراہٹ بھی گہری تھی۔

''تو پھر سمجھ لو کچھ ایسی ہی بات ہے؟''

''تعارف نہیں کراؤ گے؟'' بادل اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ہرگز نہیں۔''

''کیوں کیا اُڑا لوں گا؟'' بادل کے لب و لہجے میں شوخی کے ساتھ ساتھ جو اعتماد کی جھلک تھی وہ اُسے اُس سے بُہت ناگوار گذری۔اُس نے بھی دل جلانے والے انداز میں کہا۔

''اتنا زعم ہے تمہیں خود پر۔پر بات یہ ہے کہ وہ مال اُڑنے والا نہیں یہ مسٹر ای۔آر۔خان کا انتخاب ہے۔''

اور بادل نے زوردار ہنکارہ بھرتے ہوئے کہا تھا۔

''ہوں تو یہ بات ہے۔''

منسٹرز کی میٹنگ سے فارغ ہوکر وہ نیچے آیا اور سیدھا یونیورسٹی کی طرف بھاگا۔ ڈیپارٹمنٹ میں وہ نہیں تھی۔دو تین لڑکیوں سے پُوچھا تو پتہ چلا کہ ہال چلی گئی ہے۔اُس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔یہ سوچتے ہوئے کہ شام کو بہرحال وقت نکالے گا۔اُس نے گاڑی موڑ دی۔پر جب وہ ریس کورس روڈ کی طرف ٹرن لے رہا تھا۔اُسے دفعتاً وہ نظر آئی تھی۔قرمزی ساڑھی میں لپٹی ہوئی اُداس سی۔وہ ٹی۔ایس۔سی سنٹر سے نکل رہی تھی۔

اُسے دُکھ ہوا۔اُس کا اُداس چہرہ سرما کی چاندنی رات جیسا لگ رہا تھا۔

''لیکن یہ ساڑھی اُس پر کتنی خوبصورت لگ رہی ہے۔'' اُس نے خود سے کہا۔

اُس کے قریب جا کر بریکیں لگائیں۔ وہ یکدم خوف سے اُچھلی۔ اُس پر نظر پڑتے ہی اپنی جگہ جم سی گئی۔ وقت کے اِس ایک لمحے میں اُس کی آنکھوں میں کتنے رنگ کتنے جذبے اُبھرے۔ آنکھیں گیلی ہوگئیں۔ اُس نے فوراً دروازہ کھولا اور بولا۔

''آؤ بیٹھو۔''

''نہیں۔'' اُس کے لہجے میں سختی تھی۔

''سٹوپڈ۔ سڑک پر کھڑے ہو کر ضد مت کرو۔ تمہارے اردگرد لوگ ہیں۔ کیا سوچیں گے؟ آؤ۔''

اُس نے ہاتھ بڑھایا۔ اِس سے پہلے کہ وہ اُس کی کلائی پکڑتا۔ اُس نے فوراً بیٹھ جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

''بھاڑ میں جائے آفس اور جہنم میں جائے میٹنگ۔'' اُس نے اپنے آپ سے کہا اور گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔

''میں نے تمہیں دوسری بار ساڑھی میں دیکھا ہے۔ ساڑھی بہت جچتی ہے تم پر۔ یہ کہاں سے خریدی ہے؟''

''نیو مارکیٹ سے۔''

''اچھی چوائس ہے تمہاری۔''

اُس کے لہجے میں چھلکتا اشتیاق نمایاں تھا۔

وہ چُپ چاپ گُم سُم سی بیٹھی تھی۔ آنکھیں جو اُسے دیکھتے ہی گیلی ہوگئی تھیں اب سُوکھ گئیں۔ دل جیسے ٹھہر سا گیا۔

ایک دوکان سے اُس نے کھانے کی چند چیزیں خریدیں اور پھر جلد ہی وہ شہر سے

باہر تھے۔

ایک پُر فضا سی جگہ پر پہنچ کر اُس نے گاڑی روک دی۔ ٹیک لگائی اور اُس کی طرف دیکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بولا۔

''ہاں تو اب بتاؤ مجھے۔ کیا ناراض ہو؟''

پتہ نہیں اُس کے انداز استفسار میں شفقت اور اپنائیت تھی یا پھر سوچوں نے یکلدم مطلع ذہن کو اَبر آلود کر ڈالا تھا کہ بس جیسے اپنے آپ پر اختیار ہی ختم ہو گیا ہو۔ ٹپ ٹپ بارش سی شروع ہو گئی۔

وہ گھبرا کر بولا۔

''روتی ہو پگلی۔ مجھے خود بھی افسوس ہے نجمی۔ بخدا میں شرمندہ بھی ہوں اور معذرت خواہ بھی۔ معاف کر دو مجھے۔ میری بُہت پیاری سی دوست ہونا۔''

واقعہ یہ تھا۔

کوئی تین دن قبل وہ فزکس ڈپارٹمنٹ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ آیا تھا۔ وہ پریکٹیکل ختم کر کے جب مونا اور ملکہ کے ساتھ باہر آئی۔ مونا ہیڈ سر کے پاس جانا چاہ رہی تھی۔ کاپی پر سائن کروانا تھے۔

''چلو نا تم بھی۔'' اُس نے ملکہ کے ساتھ اُسے بھی گھسیٹنا چاہا۔

اُس نے بہتیرا نہ نہ کی۔ بھوک کی شدت اور پیٹ میں چوہے بلیاں کودنے کے بارے میں اُسے بتایا۔ پر مونا چیخی۔

''کمبخت تجھے کیا زیادہ ہابڑا پڑ گیا ہے۔ تیرے ساتھ ہی ہم بھی فارغ ہوئے ہیں۔ چل سیدھی طرح۔ فارغ ہو کر اکٹھے ہال چلتے ہیں۔''

''مونا بائی گاڈ صبح میں نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ اب وقت دیکھو چار بجنے کو ہیں۔

تچی بات ہے میں نڈھال ہوئی پڑی ہوں۔‘‘

پر مونا نے اُس کی ایک نہ سُنی۔

ٹکراؤ ہیڈ سر کے کمرے کے عین دروازے میں ہوا۔ وہ تو اُسے دیکھتے ہی گھبرا گئی۔ چہرے کا رنگ فق ہوا۔ ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ غالباً کوئی دوست تھا۔ ملکہ نے جھٹ پٹ نہ صرف سلام دے مارا بلکہ اُس دن میر پور پہنچانے کا شکریہ ادا کر دیا۔

’’میں باسی چیزیں اور باسی شکریئے قبول کرنے کا عادی نہیں۔‘‘ اُس نے ہنس کر کہا۔

وہ پردہ تھامے کھڑی تھی۔ اپنے ساتھی سے تعارف کا سلسلہ اُس نے خود ہی حل کر دیا۔

’’یہ نجمہ ہے میرے دوست کی چھوٹی بہن۔ ایکس چینج پروگرام کے تحت لاہور سے آئی ہے۔‘‘

ساتھی نے سر خم کیا اور بولا۔

’’موسم خوبصورت ہے۔ آیئے آپ اور آپ کی سہیلیوں کو تھوڑا سا گھما لائیں۔‘‘

اُس نے چہرے سے کسی ردِّعمل کا اظہار نہیں کیا۔ مگر دل میں خوش ہوئی وہ ہوم سکنس کا شکار ہو رہی تھی۔ دل صبح سے اُچاٹ اُچاٹ سا تھا۔

’’چلو تھوری سی تفریح رہے گی۔‘‘ وہ خود سے بولی۔ ملکہ اور مونا بھی تیار ہو گئیں۔ مونا کو کاپی چیک کروانا تھی۔ یہ اُن دونوں سے معلوم ہو گیا تھا کہ ہیڈ سر اندر نہیں ہیں۔

وہیں سے واپسی ہو گئی۔ بڑ تلے کے نیچے کھڑی بیلا کو بھی اُنہوں نے گھسیٹ لیا۔

راستے میں اُسے محسن ملا۔ وہ ویسٹ پاکستانی طلبہ کی ایسوسی ایشن کے ماہانہ اجلاس

میں اُسے شرکت کا دعوت نامہ دینے آیا تھا۔ جو منگل کے دن سرسلیم اللہ ہال میں ہو رہا تھا۔ وہ دونوں کافی آگے جا چکے تھے۔ ملکہ درمیان میں چل رہی تھی اُس کے ساتھ منصور باتیں کرتا ہوا جا رہا تھا۔ وہ اور مونا پیچھے رہ گئیں۔ بیلا بھی اُن کے ساتھ ہی تھی۔

اُس نے آنے کی حامی بھری اور جان چھڑائی۔ جب وہ کچھ آگے بڑھ آئیں بیلا نے کہا۔

''بُہت باتونی لگتا ہے یہ لڑکا۔ کب سے اٹنڈ کر رہی ہو اُن کے اجلاس؟''

''دو بار پہلے گئی تھی یا اب یہ دعوت نامہ ملا ہے۔''

وہ تینوں جب کار کے پاس آئیں ملکہ پیچھے بیٹھ چکی تھی۔ وہ دونوں اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ اُس کے ساتھی نے سنبھالی ہوئی تھی۔

''تم آگے آجاؤ میرے پاس۔ دھان پان سی تو ہو۔'' عام سے انداز میں کہا گیا تھا۔

وہ آگے بیٹھنا نہیں چاہتی تھی پر صورتِ حال ایسی تھی کہ انکار کی گنجائش ہی نہ تھی۔ چُپکے سے اُس کے پہلو میں دُبک گئی بالکل بلّی کے بچے کی طرح۔

چینگوا میں جب وہ داخل ہوئے وہ گُنگ سی گُترا گئی۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ اُسے اپنے پاس بٹھائے گا اور کھانے کے دوران اُس پر خصوصی توجہ دے گا۔ مونا اور ملکہ، ثریا اور نازلی جیسی کُھلے دل کی لڑکیاں نہ تھیں۔ دونوں خرانٹ تھیں اور اُڑتی چڑیا کے پَر گننے والوں میں شمار ہوتی تھیں۔ اُنہوں نے تو فوراً صورتِ حال کو بھانپ لیا تھا۔ اُس کی رُوم میٹ تھیں۔ سارا دن وہ اُن کی زبانوں سے ایسے ہی قصے کہانیاں سُنتی رہتی تھی۔

وہ ملکہ کے ساتھ چپک گئی۔ اُس نے بس ایک گہری نظر اُس پر ڈالی اور خاموش رہا۔

جب شام کا دُھندلکا باہر پھیلنے لگا وہ اُٹھے گاڑی میں بیٹھے اور گاڑی تیزی سے چلتی پل بھر میں ریس کورس روڈ پر ڈھا کہ کلب کے کمپاؤنڈ میں آ کر رُک گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے معذرت کرتے وہ دونوں اندر چلے گئے اور وہ وہیں گاڑی میں بیٹھی گپیں لگانے اور اِدھر اُدھر دیکھنے میں محو ہو گئیں۔

کلب کیسے ہوتے ہیں؟ اُس نے پڑھا تھا یا سُن رکھا تھا اور یہ پڑھا اور سُنا ہوا یقیناً اُس کے طبقے کا نمائندہ تھا اور کوئی اچھی رائے نہیں رکھتا تھا۔ وہ خاموش بیٹھی اُس انوکھی دُنیا کو دیکھنے میں مصروف تھی۔ چاند کافی اُوپر آیا ہوا تھا۔ پر ٹیوبوں کی دودھیا روشنی میں بھولی بھالی سادہ سی چاندنی کے لئے کہاں گنجائش تھی؟ بیچاری ماند ہوئی پڑی تھی۔

ویٹر چار سیون اَپ لے کر آیا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا مشروب، پُرسحر ماحول اور یہ احساس کہ یہ لڑکیاں صرف اُس کی وجہ سے اِس خواب ناک ماحول کا حصّہ بنی بیٹھی ہیں اُسے احساسِ بلندی دینے کے لئے کافی تھا۔

لاؤنج میں صاحبِ ثروت لوگ پینے پلانے اور خوش گپیوں میں مگن تھے۔ اُکیسٹرا دھیمے دھیمے سُروں میں بج رہا تھا۔ خوش پوش بیرے سروس کے لئے مستعد تھے۔

جلد ہی وہ آ گئے۔ اُس کا ساتھی بولا۔

''چلو آپ کو سیکنڈ کیپٹیل کے اُوپر سے گھماتے ہوئے ہال چھوڑ آتے ہیں۔''

پتہ نہیں اُسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ اُس پر جھکا ہوا کچھ کہہ رہا تھا۔ سرگوشیوں کے انداز میں کیا کہہ رہا تھا؟ یہ سُننے کا اُسے ہوش نہ تھا۔

''اِسے کیا ہو گیا ہے؟''

اُس کا سانس حلق میں اَٹکنے لگا۔ ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔

خوف زدہ آنکھوں سے اُس نے اُس کی طرف دیکھا۔ عجیب سے تاثرات وہاں

بکھرے ہوئے تھے۔اُس کے منہ سے بھی ناگواری بُو آرہی تھی۔

اُسے سمجھ نہیں آتی تھی وہ کیا کرے اور جب کچھ نہ بن پڑا اُس نے گھبرائے لہجے میں سرگوشی کی۔

''خدا کے لئے ٹھیک سے بیٹھئے نا۔وہ لوگ دیکھ رہی ہوں گی۔ باتیں بنائیں گی۔''

اور پھر اُس نے ہلکے سے اُس کا ہاتھ بھی دبایا۔

اُس کی سرگوشی پُر اثر تھی یا ہاتھ دبانے کا عمل شوکنگ ثابت ہوا کہ اُس نے فی الفور اپنی نشست درُست کر لی۔

اور جب وہ چاروں گاڑی سے اُتر کر ہال میں داخل ہوئیں۔ ملکہ نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے رحمان بھائی نے ڈرنک کی ہوئی تھی۔''

''ارے نہیں۔'' وہ یونہی دفاع پر اُتر آئی۔

''بائی گاڈ۔''

اور وہ سُن سے ہوئی۔کچھ مزید کہنا چاہا پر کہہ نہ سکی۔چُپ چاپ آڈیٹوریم میں آگئی۔

پر دو دن کیسے گذرے جیسے بندہ جیتے جی پھانسی کا پھندہ گلے میں ڈال لے۔نہ مرے اور نہ جئے بس درمیان میں لٹک جائے۔

پر اِس سوچ نے مرے کو مارے شاہ مدار والا کام کیا تھا۔ایک شراب پینے والے انسان کا کیا اعتبار؟ نشے میں کسی وقت بھی بہک سکتا ہے۔وہ جس پٹڑی پر بدقت چڑھی تھی یہ تلخ سوچ بار بار اُسے اُس سے اُتار دیتی۔

وہ دوبارہ اُنہی سوچوں اور اُلجھنوں میں گھر گئی تھی۔ جن سے تھوڑا سا نکلی تھی۔

باب نمبر ۱۷:

''میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھ ایک پوری رات گزارو۔''

اُس وقت وہ باہر نظاروں میں گُم تھی۔ تاحدِ نظر دھان کے سرسبز کھیتوں کے پھیلاؤ نے دھرتی پر گہرے سبزے کے جیسے قالین بچھا رکھے تھے۔ اِن میں ناریل تاڑ اور کیلوں کے جھنڈ ایک نیا رنگ سجاتے تھے۔ اور ان جھنڈوں میں گھاس پھونس کی باشاہیں کانسی اور سُرخ پھولوں سے ڈھنپی کسی مصّور کا کینوس پر بکھرے شاہکار نظر آتے تھے۔

ایسے من موہ لینے والے منظروں سے لُطف اندوزی میں اُس نے کس قدر خوفناک قسم کی بات سُنی تھی۔ دہل کر رہ گئی تھی۔

''رات۔''

اُس کی آنکھیں پھٹیں۔ اِس پھٹاؤ میں خوف کا عنصر غالب تھا۔

''ہاں ہاں بھئی گھبرا کیوں گئی ہو؟''

وہ یوں بول رہا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

''دیکھو بھئی کومیلا چلیں گے۔ بُہت خوبصورت جگہ ہے۔ دیکھو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔ بُدھا کی بُہت سے یادگار عمارات ہیں۔ بُہت بڑا زراعتی فارم بھی ہے اور ہاں ستو کومیلا کی رَس ملائی بُہت مشہور ہے۔ کھاؤ گی تو لُطف آجائے گا۔

اُس کا لہجہ بشاشت سے بھرپور تھا چہرے پر صُبح جیسی تازگی اور کسی انجانی سی مسرت کی لو دہکتی تھی۔ باتیں کرنے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اپنے گھر میں کھانے کی میز پر بیٹھا ہوا اُسے کسی پروگرام یا کہیں ٹرپ پر جانے کی تفصیلات سے آگاہ کر رہا ہو۔

اُس نے اپنی بے چینی اور اضطراب پر قابو پایا اور آہستگی سے بولی۔

''چٹا گانگ سے واپسی پر کومیلا میں سے گذرے تھے نا ۔ اُس کی جھلک تو دیکھ لی ہے، بُدھا کی بُہت سی یادگاریں میں نے خود تو نہیں دیکھیں پر میری بڑی ڈاکٹر بہن کالج کی طرف سے سوات گئی تھی اُس نے واپسی پر تفصیلاً ہمیں اُن کے بارے میں اِس طرح بتایا کہ ہم نے تصویروں اور اُن کے بیان سے اُن سبھوں کو دیکھ لیا تھا۔ اب مزید کیا دیکھنی ہیں ۔ہاں زراعتی فارموں سے مجھے قطعی دلچسپی نہیں ۔رَس ملائی میں کھا بیٹھی ہوں۔ آپ نے ہمارے لئے پورا دونا خریدا تو تھا۔''

اور یہ سب سُن کر اُس کا قہقہہ شام کی خاموشی کے سینے کو چیر گیا۔

''بُہت تیز ہوگئی ہو۔''

وہ بھی ہنسی۔ یہ ہنسی اپنے اندر متانت لئے ہوئے تھی۔

بات اُس کے حسابوں آئی گئی ہوگئی۔ پر دو تین دن بعد جب اُس نے پھر وہی بات دُہرائی تو وہ بس کنگ سی ہوگئی ۔اُوپر کا سانس اُوپر تلے کا تلے ۔چپ چاپ بیٹھی سوچتی تھی کہ اِس کی سوئی تو وہیں اَٹکی ہوئی ہے۔سانپ کے منہ میں چھچھوندر والا معاملہ ہوگیا تھا جسے نہ اُگلے بنتی ہے اور نہ نگلے۔

''تو گویا احسانات اور خلوص کا بدلہ اب یوں لینا چاہتا ہے۔''

اُس نے دُکھ سے سوچا۔

بات تو ساری یہ تھی کہ وہ اُسے شدت سے پسند کرنے لگی تھی ۔ہال سے یونیورسٹی جاتے ہوئے یونیورسٹی روڈ پر جو کہیں اُسے رائل بلیو ٹیوٹا نظر پڑ جاتی تو بس دل قابو میں ہی نہ رہتا۔ ہمہ وقت ذہن کے پردوں پر وہ تھرکتا رہتا۔ آنکھوں میں اُس کے عکس جھلملاتے رہتے ۔ ہر مرد پر اُسی کا گمان گذرتا ۔ دماغ خراب ہوگیا تھا۔ یوں اُسے خراب بھی ہو جانا چاہیے تھا کہ ہائی جنریٹری کا ایک بُہت بڑا افسر جس کی شخصیت میں خاصا گلیمر تھا۔جس کے

نیچے قیمتی گاڑی تھی۔ جو صوبائی حکومت کی کلیدی آسامی پر بیٹھا تھا۔ اُسے بے طرح پسند کرنے لگا تھا۔ پر اِس پسندیدگی میں کسی عامیانہ پن کا اظہار نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی اوچھی اور بھونڈی حرکت تھی۔ بلند بانگ قسم کے دعوے نہیں تھے۔ بس باتیں تھیں۔ گپیں تھیں۔ لونگ ڈرائیو تھی۔

کتاب میں جو کچھ وہ اب تک پڑھتی آئی تھی اور لڑکیوں کے جو قصے کہانیاں اُس نے سُنے تھے وہ تقریباً سارے ہی غلط ہو گئے تھے۔ اُس کے رکھ رکھاؤ اور اعلیٰ اطوار بہت متاثر کن تھے۔

پر پھر بھی وہ اکثر و بیشتر پریشان ہی رہتی۔ عجیب وغریب سے وسوسے اور اندیشے اُسے ڈستے رہتے۔ کبھی کبھی نا دانستہ طور پر اُن کا اظہار بھی ہو جاتا تھا۔ جن کا جواب دینے کی شاید وہ اب ضرورت نہیں سمجھتی تھی۔

تم نے جواب نہیں دیا۔

اُس نے کھڑکی کا شیشہ ایک ہاتھ سے اُوپر چڑھایا۔ ہوا میں خاصی خُنکی ہو گئی تھی۔ اُسے محسوس ہوا تھا کہ اُس کا جسم کانپ سا رہا ہے اور اُس نے اپنے آپ سے پُوچھا تھا۔

''کیا یہ اِس بات کا فوری اثر ہے؟ یا واقعی مجھے ٹھنڈ محسوس ہو رہی ہے۔''

وہ خاموش تھی۔ اُس نے کوئی بات نہیں کی۔ جب اُس کا اصرار بڑھا تب بھی اُس سے کچھ بولا نہیں گیا۔ بس ٹپ سے دو آنسو اُس کے ہاتھوں پر پڑے جنہیں وہ گود میں رکھے بیٹھی تھی۔ پتہ نہیں اُس کی نظر اُن آنسوؤں پر پڑی یا نہیں۔

وہ بڑے نرم اور ملائم سے لہجے میں اُس سے مخاطب تھا۔

''نجمی میرے پاس اب اِس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے جسے اپنا کر میں تم پر یہ

ثابت کر سکوں کہ میں تمہارے کیسے قُرب اور کیسی رفاقت کا متمنّی ہوں۔ شک و شبہات کے جو رنگ مجھے اکثر و بیشتر تمہاری آنکھوں میں نظر آتے ہیں وہ مجھے بُہت پریشان کرتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں وہ یکسر ختم ہوں اور اُن کی جگہ یقین اور اعتماد کی چمک ہو۔''

''اتنی کڑی آزمائش میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ رہی بے یقینی اور عدم اعتماد کی بات۔ آپ مجھے بتایئے اگر ایسا ہوتا تو میں آپ کو یہاں بیٹھی نظر آتی۔''

وہ جب یہ باتیں کرتی تھی اُس کی خوبصورت پیشانی پر کمان جیسی بھنوؤں کے درمیانی جگہ پر پڑتی لکیر اُس کے ذہنی انتشار کا پتہ دیتی تھیں۔

''جانتی ہو آزمائش انسان کو کُندن بنا دیتی ہے۔''

اور اُس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے کہا تھا۔

''کُندن کیا کرنا ہے؟ انسان سونا ہی بنا رہے تو غنیمت ہے۔''

وہ زیرِ لب مسکرایا اور بولا۔

''کبھی میں تو تمہیں اللہ میاں کی گائے سمجھتا تھا۔ پر تم تو باتیں کرنے میں بڑے بڑوں کے کان کاٹتی ہو۔''

باقی وقت دونوں کا خاموشی میں ہی کٹا اور جب وہ اُسے رقیہ ہال گیٹ کے سامنے ڈراپ کر رہا تھا اُس نے کہا۔

''نجمی کل تیار رہنا۔ میں تقریباً تین چار کے درمیان تمہیں پک کروں گا۔''

''مگر۔۔۔''

اُس کے ہونٹ کانپے اور ساتھ ہی پاؤں میں بھی لڑکھڑاہٹ ہوئی۔

''اگر مگر کا کوئی سوال نہیں۔ تمہاری ہاؤس ٹیوٹر سے رات باہر گذارنے کی اجازت میں خود لوں گا۔ اچھا کل تک کے لئے خدا حافظ۔''

اُس نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھائی اور زن سے سڑک پر نکل گیا۔ پل بھر رُکنے اور اُس کی کوئی بات سُننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

وہ بڑی شکستہ سی ہو رہی تھی۔ ساری شگفتگی جیسے ماند سی پڑی ہوئی تھی۔ آڈیٹوریم تک پہنچتے پہنچتے اُسے یوں لگا جیسے وہ میلوں کی مسافت پا پیادہ طے کرتی آ رہی ہو۔ بھوکی پیاسی، اور اب اِس درجہ چُور چُور کہ بس دھڑام سے فرش بوس ہونے والی ہو۔

ڈائننگ ہال میں غُل غپاڑہ مچا ہوا تھا۔ اُس نے خود کا جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ اُسے یکسر بھوک نہیں ہے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اُس نے بتی جلائی۔ تیز روشنی میں چند لمحوں کے لئے وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کسی متحرک خاموش تصویر کی مانند کھڑی رہی۔ خود کو بغور دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آف کر دیا اور بستر پر گر گئی۔

''مجھے جانا چاہیے یا نہیں؟''

یہ سوال اُس نے بار بار خود سے کیا۔

ناڑ ناریل اور کیلوں کے جھنڈوں سے گھرے سرکٹ ہاؤس کی خوابگاہ نے اُسے اِس درجہ خوفناک مناظر دکھائے کہ وہ بلبلا اُٹھی اور تڑپ کر اپنے آپ سے بولی۔

''میں جو کچھ بن بیٹھی ہوں ایسا بننا میں نے سدا چاہا تھا۔ کوئی کہے یہ خود فریبی ہے یہ اپنے آپ سے، اپنے والدین سے، اُن کی عزت وحُرمت سے، کُھلا دھوکا ہے۔ دُرست ہے۔ مجھے اعتراف ہے اُس کا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن کیا کروں۔ انسان اپنے آپ سے مجبور ہوتا ہے۔ میں بھی مجبور ہوں۔ اِن تشنہ سی چھوٹی چھوٹی آرزوؤں کے سامنے جو میرے سینے میں ہمہ وقت ہی بھانبڑ مچائے رکھتی تھیں۔ لیکن اب یہ بھی میرے لئے ممکن نہیں کہ میں اُن کی اتنی بڑی قیمت دوں۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہتی کہ سرکٹ ہاؤس کی تنہائیوں میں آگ اور تیل مل جائیں۔''

اور جیسے اندر سے کسی نے مدافعت کی۔ایک آواز آئی تھی۔

''تم ایک عرصے سے اُس سے تنہائیوں میں ملتی رہی ہو۔اُس نے اعتماد کو کہیں مجروح نہیں کیا۔''

''اور جانا چاہیے یا نہیں جانا چاہیے'' کے مسئلے پر ایسی خوفناک جنگ ہوئی کہ جب آڈیٹوریم کے کلاک نے دو بجائے۔وہ خود سے لڑتے لڑتے نڈھال ہو چکی تھی۔سر ٹیسوں سے پھٹا جا رہا تھا۔آنکھیں یوں جل رہی تھیں جیسے کسی نے دو دہکتے ہوئے کوئلے اُن پر رکھ دیئے ہوں۔وہ بے چین تھی۔کسی پل قرار نہ تھا۔یوں مضطرب تھی جیسے سارے جسم میں پارہ بھر دیا گیا ہو۔پتہ نہیں رات کے کس حصّے میں اُس کی آنکھ لگی۔صُبح اُٹھ کر جب اُس نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو دنگ رہ گئی۔ایک رات کے کرب نے اُسے یوں نچوڑ دیا تھا جیسے پانی سے بھرا کپڑا فولادی ہاتھوں میں آکر نچڑ جاتا ہے۔

لیکن اتنا ضرور ہوا تھا کہ اُس کا بے قرار ڈوبتا دل قدرے تسکین پا گیا تھا۔وہ یونیورسٹی نہیں گئی۔سوچا کہ گیارہ بارہ بجے تک جو چھوٹے موٹے کام کرنے والے ہیں اُنہیں نپٹا لے۔جب وہ آئے گا وہ سو رہی ہو گی۔مینو سے کہہ دوں گی کہ وہ مجھے باہر سے آئے ہوئے کسی بھی پیغام پر نہ اُٹھائے۔

بارہ بجے اُس نے غسل کیا۔کھانا کھایا اور سو گئی۔

ڈھائی بجے کے قریب مُونا نے اُسے جھنجھوڑ کر اُٹھایا۔

''اللہ کیا بھنگ پی کر سوئی ہو جو اُٹھنے کا نام نہیں لے رہی ہو۔باہر سے تمہارے وزیٹر کی چٹوں پر چٹیں آرہی ہیں۔مینو غریب کی تو سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ٹانگیں بھی ٹوٹ گئی ہوں گی۔لفٹ خراب ہے۔اُس کا تو حشر ہو گیا ہے۔

مانو اُس کا کلیجہ اُچھل کر جیسے حلق میں آگیا تھا۔تیر کی طرح بستر سے اُٹھی اور لپک

کر باہر آئی۔ مینو کھڑا تھا۔ اُس نے اُس کی معصوم سی صورت پر غصّے بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''حد کرتے ہو مینو۔ میں نے تمہیں کیا کہا تھا؟''

''ارے آپا میں نے بہتیرا کہا کہ وہ ہال میں نہیں ہیں۔ اپنی بُندھو لوگ کے ساتھ باہر گئی ہیں۔ پر صاحب مانے نہیں۔ بس یہی کہتے رہے۔

اپنے کمرے میں ہو گی۔ جاؤ جا کر پیغام دو۔ اب بتایئے آپا میں کیا کرتا؟''

وہ کھڑی کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر اسی طرح نیچے چل دی۔

یہ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ وہ فیصلہ جسے کرنے کے لئے اُس نے ساری رات ایک طرح کانٹوں کی سیج پر گذاری تھی۔ اپنے آپ سے لڑتے لڑتے لہولہان ہو گئی تھی۔ اُس پر نظر پڑتے ہی وہ اِس قدر ریود اثابت ہو گا کہ پل نہیں لگے گا اور تڑاق سے ٹوٹ کر وہ گرے گا۔

اُس کی آنکھوں میں موتیوں کی مانند آنسو پلکوں پر آ کر ٹھہر گئے تھے۔ آواز بھرّا گئی تھی۔ جب اُس نے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر کہا تھا۔

''مجھے نہیں جانا۔''

اُس کی پلکوں پر چمکتے موتیوں کو دیکھ کر وہ بے کل سا ہوا۔ جی چاہا اُس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں تھام لے اور اِن موتیوں کو نیچے گرنے کی بجائے اپنے دل میں کہیں محفوظ کر لے۔

اُس کی رونکھی آواز اُسے خواہش کی دُنیا سے عملی دُنیا میں واپس لے آئی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''رات بھر ہلکان ہوتی رہی ہو۔ بے وقوف لڑکی۔ چلو بیٹھو۔ یہ سوچنا میرا کام ہے

کہ تمہیں جانا ہے یا نہیں۔''

وہ گُم سُم کھڑی ٹکر ٹکر اُسے دیکھتی رہی۔

پل بھر کے لئے اُس کا جی چاہا وہ بھاگ جائے۔ پر وہ بھاگ بھی نہیں سکتی تھی۔

''سنا نہیں میں نے کیا کہا ہے؟ آؤ بیٹھو۔''

اُس کی آواز میں محبت اور شفقت کی مہک تھی۔

ڈھاکہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ شام کی ٹھنڈی لطیف ہوائیں پوکھروں میں کھلے کنولوں پر سے تیرتی ہوئی اندر آرہی تھیں۔ وہ خاموش تھا اور اب وہ چاہ رہی تھی کہ وہ اُس سے کوئی بات کرے۔ اُس سے پُوچھے کہ اُسے کن کن اندیشوں اور وسوسوں نے گھیرے رکھا؟ اپنے عہد کو دہرائے۔ یقین دہانی کروائے۔

راستے کی پہلے فیری آئی۔ اُسے یاد آیا جب وہ لوگ چٹا گانگ جا رہے تھے۔ اچانک سڑک کٹ گئی۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی ندی حائل ہوگئی۔ اُس نے حیرت سے اُسے یوں دیکھا تھا جیسے پُوچھ رہی ہو۔ اب کیا ہوگا؟

اُن سب کے لئے تو فیریاں نئی نہ تھیں۔ اُن کے ماحول کا حصّہ تھیں۔ جانی پہچانی چیزیں تھیں۔ لہٰذا وہ سب اُس کی حیرت پر ہنسے تھے۔ اُس نے جب اِن سب کو اُتارا۔ گاڑی کو روک لیا۔ اور اُس کے قریب آکر بولا۔

''تیرنا آتا ہے کیا؟''

اُس نے بے ساختگی سے کہا تھا۔

''میں تو میدانوں کی پیداوار ہوں۔''

''بس پھر تمہارا تو اللہ بیلی۔ ڈوب گئیں تو میں ہرگز نہیں نکالوں گا۔''

''اچھا میں اتنی گری پڑی ہوں کہ آپ مجھے اِن پانیوں کے حوالے کردیں گے؟''

اُس نے تڑاخ سے یہ کہا تھا۔

''پراب؟'' وہ کھلی فضا میں لمبا سانس لیتے ہوئے اپنے آپ سے بولی تھی۔

''زندگی سے بیزار ہوگئی ہوں میں تو۔''

وہ دھیمے سے مُسکرایا تھا۔

اُس کی مُسکراہٹ دیکھ کر اُس نے سوچا۔

''کیا اُس نے میرے دل کی بات پڑھ لی ہے؟''

اُس وقت بھی وہ گھڑ گھڑ کرتی فیری پر کھڑے تھے۔ وہ دُور اُفق پر دیکھ رہی تھی۔ دُھوپ میں خوشگوار سی حدّت تھی۔ نیلا شفاف آسمان آنکھوں کو بھلا لگتا تھا۔ ارد گرد کے نظارے دلفریب تھے۔

شام ڈھل گئی تھی۔ بازاروں میں روشنی ہو چکی تھی۔ جب وہ کومیلا پہنچے۔ تنگ سا بازار چھوٹی چھوٹی ٹین کی چھتوں والی دُکانیں جن میں دھوتیاں پہنے سُوکھے مریل سے دُکاندار گاہکوں کو نپٹانے میں مصروف تھے۔ مٹھائی کی ایک دُکان کے سامنے اُس نے کار روکی اور بنگلہ میں کچھ کہا۔ دکاندار نے دونا اُسے پکڑا دیا۔

شہر پرانا تھا۔ چھوٹے چھوٹے مکان، کہیں کہیں پختہ راجباڑیاں بھی سر اُٹھائے کھڑی تھیں۔ شہر کے بیرونی حصے میں نئے طرز کی کوٹھیاں تھیں جو یقیناً اعلیٰ عہدیداران کی تھیں۔ سرکٹ ہاؤس میں روشنیاں گُل تھیں اور عمارت میں اُلّو بولتے نظر آتے تھے۔ وہ اُسے کار میں ہی بٹھا کر خود چوکیدار کو دیکھنے اندر گیا۔ دیر بعد آیا اور اُسے اندر لے گیا۔ ڈائننگ ہال میں اُنہوں نے رات کا کھانا کھایا۔ وہیں چائے پی اور رس ملائی بھی کھائی جس کی وہ بے حد تعریف کرتا تھا۔ اُس نے بڑے سکون اور فارغ البالی سے سبھی چیزوں پر ہاتھ صاف کئے۔ پر وہ ڈھنگ سے کچھ بھی نہ کھا سکی۔ آنے والے لمحوں کے تصوّر نے بھُوک

پیاس اُڑا دی تھی جو تھوڑا بہت کھایا وہ بھی اُس کے پیہم اصرار پر۔

اور جب دس بجے وہ اُس کے ہمراہ بیڈروم میں داخل ہوئی ۔قدم من من بھر کے ہو رہے تھے جنہیں وہ بمشکل زمین سے گھسیٹ رہی تھی جو ہر آن اُسے یہ احساس دلا رہے تھے ۔جیسے وہ موت کے کنوئیں میں گرنے جا رہی ہو ۔کسی صلیب پر چڑھنے والی ہو ۔پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالنے والی ہو۔کمرے میں صاف ستھرے بستر جن پر مچھر دانیاں لگی ہوئی تھیں ۔اُن کے منتظر تھے۔

تب اُس نے اُسے شانوں سے پکڑا اور بیڈ پر بٹھاتے ہوئے بولا۔

''یہ ساتھ ہی باتھ روم ہے ۔شب میں اگر استعمال کی ضرورت پڑی تو بلاخوف وخطر استعمال کرنا۔میں تمہیں یقین سے کہتا ہوں کہ اگر ساری رات تم میرے سینے سے لپٹ کر سوتی رہو تو بھی تم صُبح ایسے ہی اُٹھو گی جیسی رات سوئی تھیں ۔خود پر یقیناً اتنا اختیار مجھے حاصل ہے ۔چلو اب آرام سے لیٹ جاؤ۔میں مچھر دانی ٹھیک کردوں ۔یہاں مچھروں کی اتنی بہتات ہے کہ اگر ایک مچھر بھی اندر گھُس آیا تو ساری رات آنکھوں میں کٹ جائے گی۔

وہ کروٹ بدلے اپنی دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے میں لگی ہوئی تھی۔کان ذرا سی آہٹ پر چونک چونک پڑتے تھے ۔خوابگاہ میں نیلا رنگ پھیلا ہوا تھا۔وہ بھی شاید اپنے بستر پر لیٹ چکا تھا۔کچھ ہی دیر بعد اُس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز سے وہ سمجھ گئی کہ وہ سو چکا ہے۔اُس کی ساری رات ہی البتہ کچھ سوتے اور کچھ جاگتے گذری۔صُبح کے قریب نیند کی جھونک گہری تھی جس نے اُسے دن چڑھے تک سلائے رکھا۔جب جاگی تو دھوپ کھڑکیوں کے راستے اندر آرہی تھی ۔سارے بستر میں سُورج کی کرنیں مچھر دانی کے مُنے مُنے سوراخوں میں سے گذر کر عجیب سے ڈیزائن بنا رہی تھیں ۔مُسرت وانبساط کی لہریں اُس کے رَگ رَگ

میں دوڑیں، مسہری سے باہر نکلی، دوسرا بیڈ خالی تھا۔ کھڑکی سے باہر لان میں اُگے درختوں پر اور گھاس کے چھوٹے چھوٹے قطعوں پر پھیلی روشنی اُسے بتا رہی تھی کہ دن کافی چڑھ آیا ہے۔ اُس نے گھڑی دیکھی نو بج رہے تھے۔

جلدی سے باتھ روم میں گھسی۔ کپڑے شکن آلود تھے۔ اُس نے منہ دھویا۔ کپڑوں پر گیلے پانی سے تر ہاتھ پھیرا کہ اُن کی شکنوں میں کچھ کمی آئے۔ کنگھی کی اور باہر آئی۔ وہ برآمدے میں بیٹھا "مارننگ نیوز" پڑھ رہا تھا۔ وہ اُس کے قریب پڑی خالی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ اخبار پڑھتے پڑھتے ایک اُچٹتی سی نظر اُس نے اُس پر ڈالی۔ اُس کے چہرے پر بشاشت اور تازگی تھی۔

طلسماتی حُسن و جمال سے بھرے پرے اِس ماحول میں ایزی چیئر پر بیٹھے اُس وجیہہ مرد کے سیاہ سلیپروں سے باہر نکلے ہوئے صحت مند پاؤں گھٹنے پر پھیلے اخبار اور اُس پر جھکے گھنے سیاہ بالوں سے پُر سر کو دیکھ کر اُسے وہ خواب یاد آئے تھے۔ جو جوان ہونے کے بعد ہر لڑکی کی آنکھوں میں اپنے خیالوں کے مطابق در کرتے ہیں۔

نوکر نے چائے کی ٹرالی قریب لا کر کھڑی کی۔ ٹی کوزی سے ڈھنپی چائے دانی جس کے اندر خوشبو کو اپنے آپ میں سمیٹے قہوہ دم تھا۔ اُس نے ڈھکن اُٹھایا اور چائے کی مدہوش کن خوشبو اُس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ اُس نے نہیں پوچھا تھا کہ وہ کتنی چینی اور کتنا دودھ پیتا ہے۔ کیونکہ اب وہ اُس کے متعلق بہت کچھ جانتی تھی۔ چائے بنانے کے طور طریقوں سے واقف ہو گئی تھی۔ ذہین تھی ہر بات کو فوراً دیکھ کر مہارت سے اُسے کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

جب واپسی کے لئے روانہ ہوئے اُس وقت ساڑھے دس بج رہے تھے۔ شہر کے بیچوں بیچ گذرتے ہوئے اُس نے کومیلا کے بارے میں مختصراً اُسے بتایا۔ پھر وِلج اینڈ اکیڈمی

کے سامنے آ کر رُک گیا۔

دربان سے اُس نے بنگلہ میں کچھ پوچھا تھا۔اُس کے نفی میں جواب دینے پر اُس نے گاڑی کو سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے افسوس ہے میں تمہیں اِس عظیم شخصیت سے نہ ملوا سکا جو اِس اکیڈمی کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔دفعتاً اُس نے پوچھا۔

''تم نے علامہ مشرقی کے بارے میں کچھ پڑھا سنا ہے۔''

''خاکسار تحریک والے۔'' وہ جواباً بولی۔

''بالکل وہی، اختر حمید علامہ مشرقی کے داماد ہیں۔بنگال کی سرزمین سے اُنہیں بُہت پیار ہے۔یہیں ڈیرے ڈنڈے ڈال لئے ہیں۔ایسا درویش اور دلربا بندہ بیوروکریٹ ہو کر بھی بوریا نشین، کیمبرج کا تعلیم یافتہ۔برطانوی دور میں جب آئی۔سی۔ایس ہوا تو بنگال میں تعینات ہوا۔یہ پہلا بڑا افسر تھا جس نے ایک عام دیہاتی آدمی کی مشکلات کو سمجھا۔اُس نے اپنے آپ کو موبائل عدالت کی شکل دے کر مقدمات کا فیصلہ خود دیہاتوں میں جا کر کرنے کا تجربہ شروع کیا۔جو نہایت کامیاب رہا۔پھر اُس نے شاندار ملازمت سے استعفیٰ دے کر معمولی سی دوکان کھول لی۔میرے بڑے بھائی نے اُن سے ایسا کرنے کی وجہ پُوچھی تو ہنستے ہوئے کہنے لگے۔

''یار میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ایک غریب اور مزدور آدمی کیسے زندگی گذارتا ہے؟''

تمہی اگر تم اُنہیں دیکھتیں تو حیرت زدہ رہ جاتیں۔اُن کا لباس کومیلا کی کھڈی کے تیار کردہ کپڑے سے بنا ہوتا ہے۔اکیڈمی میں آنے والے زیرِ تربیت افسروں کو وہ بانسوں سے تیار کردہ جھونپڑیوں میں رکھتا ہے۔وہ ہنستے ہوئے کہتا ہے۔

''میں چاہتا ہوں جب یہ واپس جائیں تو اُن کی اَنا ختم ہو چکی ہو اور وہ پورے طور

پر ڈی کلاس ہو چکے ہوں۔''

مجھے افسوس ہے تم اِس نابغہ روزگار شخصیت سے نہ مل سکیں۔

اُس نے پُوچھا تھا۔

''کیا ملک سے باہر ہیں؟''

''نہیں۔بس آج صُبح میمن سنگھ گئے ہیں۔معلوم ہوتا تو رات کو آجاتے۔''

واپسی کا یہ سفر بُہت خوشگوار تھا۔وہ خوب باتیں کر رہی تھی۔اُس کی آواز میں اعتماد اور سرشاری کی کیفیت تھی۔دفعتاً اُس نے کہا۔

''ایک بات بتائیں گے آپ مجھے؟''

''پوچھو۔''

''یہ جو کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔لوگ کہتے ہیں۔آگ اور تیل کے مفروضے بیان کرتے ہیں۔فرائڈ کو کوڈ کرتے ہیں۔یہ سب غلط ہیں کیا؟''

اور اُس نے غایت سکون سے کار چلاتے ہوئے کہا تھا۔

''نہیں اُنہیں غلط تو نہیں کہا جا سکتا۔اصل میں نفس پر ضبط کی ضرورت ہے جو قابو پالے۔''

باب نمبر ۱۸:

اب یہ کہیں ممکن تھا کہ جاؤ واورو ہ بھی عشق کا بھلا سر چڑھ کر نہ بو لے گا تو پھر کیا قدموں میں آہ وزاریاں کرتا پھرے گا۔ وہ اِس میدان کی کوئی تجر بہ کار کھلاڑی تو تھی نہیں کہ دل اور دماغ سنبھال کر رکھتی اور اِس نئی مُصر وفیت کو روز کے شیڈول میں کسی نہ کسی طرح ایڈ جسٹ کر لیتی ۔ دل تو پہلے ہی قابو میں نہ تھا اِک دماغ تھا جو اکثر و بیشتر اُلٹے سیدھے اعتراض کر کے اُسے اُلجھائے رکھتا پر کومیلا میں رات گذار آنے کے بعد وہ بھی خاموش ہو گیا تھا۔

کتابیں کھولتی تو ہر صفحے پر وہ بیٹھا ہوتا ۔ آنکھیں بند کرتی تو اُس کے سینکڑوں رُوپ تصور کے پردے پر تھر کتے نظر آتے ۔ کھانا کھانے لگتی تو سوچتی کہ وہ اِس وقت اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کھانا کھا رہا ہوگا اور اُس کی بیوی کا خیال آتے ہی وہ اندر ہی اندر کٹنے لگتی۔ پھر اپنے آپ سے کہتی ۔

''خوش قسمت ہے جو ایسا اچھا شوہر ملا۔''

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا وہ اُس کی بیوی کو غائب کر دیتی خود اُس کی جگہ لے لیتی ۔ وقت کے ایسے لحات کا تصور کس قدر جانفزا ہوتا ۔ پر حقیقت کی دُنیا کی کڑواہٹ اُسے بعد میں اُتنا ہی تڑپاتی ۔ اُس کی گفتگو اور روزمرّہ بات چیت سے اُس نے اتنا ضرور سمجھ لیا تھا کہ اُن کے تعلقات ناخوشگوار نہیں ۔

کبھی کبھی سوچوں کے حصار میں یوں گھر جاتی کہ باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہی نظر نہ پڑتا ۔ اپنے آپ سے لڑتی ۔ قسمت کو کوستی ۔ صبیحہ کو بد عائیں دیتی جو اِس ملاقات کا باعث بنی تھی ۔ اپنے آپ کو لعن طعن کرتی ۔ اپنا خون جلاتی ۔ کر بناک خیالات اُن جونکوں کا رُوپ

دھار بیٹھے تھے۔ جو بدن کے ساتھ چپک کر خون پی پی کر کُپّا ہوتی رہتی ہیں اور انسان کو اندر ہی اندر کھوکھلا کرتی جاتی ہیں۔

مصیبت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے دُکھ درد کا اظہار کسی سے کر بھی نہیں سکتی تھی۔ اندر ہی اندر نمک کی طرح گھُلتی جا رہی تھی۔ وہ اگر کبھی کوئی بات پُوچھتا تو فوراً اُس کی تردید کر دیتی۔ کبھی وہ ہنس پڑتا۔ اُس کی ہنسی کچھ ایسی ہوتی جیسے کہتی ہو مجھ سے چھپاتی ہو۔ میں تمہارے دل کا حال رتّی رتّی جانتا ہوں اور کبھی ایسا بھی ہوتا وہ خاموش ہو جاتا۔

ہفتہ بھر سے وہ بیمار تھی۔ پہلے دو تین دن تو اُس نے کوئی پرواہ ہی نہ کی۔ نہ کوئی دوائی لی اور نہ ہی کسی قسم کا پرہیز کیا۔ اصل میں وہ نخروں کی عادی نہ تھی۔ لاپرواہ سے ماحول نے سخت جان بنا دیا تھا۔

یہاں پردیس میں کسے ضرورت تھی کہ دیکھے اُس کا رنگ املتاس کے پھولوں جیسا ہو رہا ہے۔ وہ پیلی پڑتی جا رہی ہے۔ اُس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں اور اُس کا جسم کمزور ہوتا جا رہا ہے۔

ہر وقت رہنے والی ہلکی ہلکی حرارت نے اُسے زیادہ نحیف کر ڈالا تھا۔ وہ جو اُسے بالکل اپنا لگتا وہ بھی ہفتہ بھر سے غائب تھا۔

پہلے تین چار دنوں میں بستر پر لیٹے لیٹے وہ اچانک اپنی بند آنکھیں کھول دیتی۔ یوں لگتا جیسے بیرا چلایا ہو۔

''آپا آپ کے وزیٹر آئے ہیں۔''

لیکن دروازہ بند ہوتا۔ کھڑکی کی جالی سے کوریڈور کا سُونا پن اور چلتی پھرتی خاموشی نظر آتی۔

پھر ایک آس، ایک اُمید نے جگہ لے لی۔ وہ آنکھیں کھولتی۔ چونک کر باہر کی

طرف رُخ کرتی کہ شاید بیرا چلا ئے ۔اُمید کی یہ جوت بار بار جلتی اور بجھتی حتی کہ رات گہری ہو جاتی ۔یہ جان لیوا خیال کہ وہ کیوں نہیں آیا ؟ اُسے اور بھی پریشان کرتا ۔کبھی کبھی سوچتی کہ وہ اُس کی بور رفاقت سے اُکتا گیا ہے جو اُس نے پلٹ کر اُس کی خبر تک نہیں لی ۔

یہ خیال اُسے اتنا تڑپاتا کہ بے کل ہو کر وہ بیڈ سے گر گر جاتی ملکہ اُسے سنبھالتی ۔ بیلا اُسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لئے اصرار کرتی ۔مگر وہ کسی کی نہ سُنتی ۔یوں لگتا تھا جیسے اپنے آپ سے انتقام لے رہی ہو ۔

علاج اور پرہیز سے لاپرواہی ،کربناک خیالات کی ہر لمحہ دماغ پر یورش نے جو اثر دکھانا تھا ظاہر ہے وہ دکھایا ۔ہفتہ بھر کی بیماری میں ہی مہینوں کی مریض نظر آنے لگی ۔ثریا اور نازلی اپنے کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لئے پارہتی پور گئی ہوئی تھیں ۔وہاں سے لوٹیں تو ملنے آئیں ۔اُس کا حال دیکھ کر دنگ رہ گئیں ۔

''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تپ دق کی مریض لگتی ہو ۔کسی کو چیک بھی کروایا ہے؟یا یونہی لاپرواہی برت رہی ہو ۔چلو گھر چلو ۔ہم اپنے فیملی ڈاکٹر سے تمہارا مکمل چیک اَپ کرواتے ہیں ۔یوں بھی گھر میں دیکھ بھال اچھی طرح ہو گی ۔اب ہوسٹل میں تو پرہیزی کھانے کا بھی مسئلہ ہے ۔''

''ارے یوں ہی گھبرا گئی ہو ۔ایسے چھوٹے موٹے بخار کو تو میں نے کبھی لفٹ نہیں کروائی ۔''

اُس نے اُنہیں مُطمئن کرنے کی اپنی سی پوری کوشش کی ۔

دل میں خود سے کہا بھی ۔

''اچھا لگتا ہے کوئی فضول میں دوسرے لوگوں پر بار بنتی پھروں ۔''

ثریا اُس سے زیادہ قریب تھی ۔اِسی نسبت سے وہ زیادہ فکر مند تھی ۔اُس کے انکار

کو اُس کی ہٹ دھرمی کہتے ہوئے ملتجی تھی کہ وہ اُن کے گھر چلے۔ اُس نے دونوں بہنوں کے احساس اور اُن کی فکر مندی کو محسوس کرتے ہوئے باری باری اُن کے ہاتھ پیار سے تھپتھپائے اور کہا۔

''میں تمہاری محبت کی بُہت شکر گذار ہوں۔ بس دو تین دنوں کی بات ہے بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔ پہلے کی نسبت تو کافی بہتر ہوں۔ تم لوگوں نے چونکہ دنوں بعد دیکھا ہے اِس لئے گھبرا گئی ہو۔''

بخار کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ اپنی مرضی سے آتا اور جاتا تھا۔ رات بھر جسم تپتا رہتا اور صبح ٹھنڈا ہو جاتا۔ منہ کا ذائقہ کڑوا ہو گیا تھا۔ کھانے پینے میں لذت نہیں رہی تھی۔ موسم کو دیکھتی تو جیسے زہر گھلا ہوا نظر آتا۔ زندگی بے مصرف اور فضول نظر آنے لگی تھی۔ ایسی بے بسی اور بے چارگی کا سماں تھا کہ اپنا آپ قابل رحم محسوس ہونے لگا تھا۔

درد جب انتہا پر پہنچ گیا۔ تب ایک دن وہ اپنے آپ سے بولی۔

''پاگل پن اور حماقت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ سچی بات ہے اپنے جنون میں اُسے بھی پار کر بیٹھی ہوں۔ بغیر پروں کے ہواؤں میں اُڑنا شروع کر دیا تھا۔ اب منہ کے بل زمین پر گری ہوں تو ہوش ٹھکانے نہیں آ رہے ہیں۔ خوابوں کے جزیروں میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ نتیجہ یہی ہونا تھا کہ اب بیٹھی راہ تکتی ہوں کہ کب وہ مسیحا آئے اور کب میرے زخموں پر مرہم رکھے؟''

"لعنت ہے مجھ پر۔

''تف ہے میری صورت پر۔''

اُس نے اپنے آپ کو مضبوط کیا۔ تسلی اور حوصلے کے ہر ممکنہ لفظ سے خود کو بہلایا۔

اگلے تین چار دن اُس نے باقاعدگی سے ہال کی ڈاکٹر کو رپورٹ کی۔ ٹھیک وقت

پر دوائی لی۔ کھانے پینے کا خیال رکھا۔ اپنے آپ کو بار بار سمجھایا پر دل تھا کہ پھر بھی ڈوب ڈوب جاتا۔

بخار نے ذرا سی مہلت دی تو وہ برٹش لائبریری گئی۔ ریفرنس بکو سے کچھ نوٹس بنانا تھے۔ کتاب کا آدھ صفحہ بھی نہ پڑھ پائی تھی کہ سر چکرانا شروع ہوگیا۔ جسم بھی ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس نے سر کتاب پر رکھ دیا۔ آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں۔ جب اچانک اُسے احساس ہوا جیسے کسی نے کہا ہو۔

''نجمی۔''

سر اُٹھایا آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچنے لگے۔ وہ کھڑا تھا۔

''کیا ہوگیا ہے تمہیں۔'' اُس کے لہجے میں تشویش تھی۔

تب اُس نے اُس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور گھبرا کر بولا۔

''بخار ہے تمہیں۔''

چند لمحوں تک اُس کا ہاتھ اُس کے بازو پر رہا اور وہ اُسے فکرمندی سے دیکھتا رہا پھر اُس نے کہا۔

''طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو یہاں کیوں آئی تھیں؟ صحت ضروری ہے یا پڑھائی۔ چلو اُٹھو۔''

جی میں تو آیا ہاتھ جھٹک دے اور کہے فرصت مل گئی ہے۔ آپ کو میرا حال پُوچھنے کی؟ پر ایسا کرنے اور کہنے کی جرأت کہاں سے لاتی؟ اُس کے سامنے تو یوں بھی زبان کو تالا سا لگ جاتا۔

گاڑی میں بیٹھ کر وہ خود ہی بولا۔

''طاہرہ کے بھائی کا کلکتہ میں انتقال ہوگیا تھا۔ گیارہ بجے اطلاع ملی تو اتنا وقت

نہیں تھا کہ میں تمہیں کچھ بتا سکتا۔ نیپال کے راستے کلکتہ جانا پڑا۔ جوان موت تھی دس بارہ دن لگ گئے۔ آج ہی واپس آیا ہوں۔ ہال گیا تو پتہ چلا کہ تم بیمار ہو۔''

پھر وہ اُسے لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا۔ تفصیلی معائنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا اگر احتیاط نہ کی گئی تو بخار طول پکڑ سکتا ہے۔

''میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ مجھے ہال اُتار دیجئے۔''

اُس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا۔ کیونکہ وہ اُسے گھر لے جا رہا تھا۔

''سنو مجھی مجھے بے جا ضد کرتی عورتیں سخت ناپسند ہیں۔ طاہرہ سے میری لڑائی اِسی بات پر ہوتی ہے کہ وہ اپنے اِس حق کو غلط استعمال کرتی ہے۔ تم کس حد تک ٹھیک ہو تمہیں ہال چھوڑنا چاہیے یا گھر لے جانا ضروری ہے اِس کا فیصلہ کرنا میرا کام ہے۔ ہاں اگر تمہیں میرے اتنے دن غائب رہنے پر افسوس اور گلہ ہے جو یقیناً ہونا بھی چاہیے تو میں اِس کی وجہ بتا چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ انسان کے ناطے میری یہ عدم موجودگی نہایت ضروری تھی۔''

اُس نے بات کاٹی۔

''میں نے تو آپ سے کچھ نہیں کہا۔''

''یقیناً تم نے کچھ نہیں کہا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ پردیس میں بیماری کی حالت میں تم احساس کی جس آگ میں جلی ہو اُس کی تپش تمہارے کچھ نہ کہنے کے باوجود مجھے محسوس ہوتی ہے۔''

''اور اب آپ اُس کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔'' اُس نے ونڈ سکرین سے باہر فضاء کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اُس نے بڑی گہری نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔ لہجے میں چھلکتے طنز اور اُس کی

کاٹ کو محسوس کیا تھا اور متحمل انداز میں بولا تھا۔

''ہرگز نہیں۔''

''تم ٹھیک نہیں ہو۔ تمہیں مناسب علاج اور مکمل آرام کی ضرورت ہے جو تمہیں ہال میں نہیں مل سکتا اور اس کے لئے میرے گھر سے زیادہ موزوں اور کوئی جگہ نہیں۔''

''مگر میں آپ کے گھر کیسے جا سکتی ہوں؟ وہاں آپ کی بیوی بھی تو ہوگی وہ کیا خیال کرے گی؟''

وہ کسی قدر جھنجھلا کر بولی۔

''فی الحال گھر خالی ہے۔ لیکن اگر وہ ہوتی تب بھی میں تمہیں اپنے گھر ہی لے کر جاتا۔''

باب نمبر ۱۹:

چاندنی فسوں خیز تھی اور ماحول سحر زدہ۔ دھان منڈی کے غربی حصے میں واقع شاندار گھر کی بیرونی منڈیر پر وہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اُس کے پاس ہی وہ بھی بیٹھا ہوا بائیں ٹانگ کو ہولے ہولے ہلا رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سنہرا ڈبہ تھا جس کے ڈھکن کو وہ کبھی کبھی انگشت شہادت سے بجانے لگتا۔

ڈھاکہ ابھی ملگجے اندھیرے میں ڈوبا ہی تھا اور چاند ابھی درختوں کے بہت پیچھے تھا جب اُس نے اُسے رقیہ ہال سے پک کیا۔ نیل کھیت سے چھوٹی مارکیٹ والی سڑک پر جب اُس نے گاڑی موڑی تو بولا۔

''تمہاری گھڑی گم ہوگئی تھی نئی نہیں خریدی۔''

اِس اچانک سوال پر وہ ٹپٹا سی اٹھی۔ چند لمحوں کے لیے اُس سے کچھ بولا ہی نہ گیا پھر اُس نے آہستگی سے کہا۔

''گھر پر لکھا تو تھا۔ جواب بھی آیا تھا کہ جلد ہی نئی بھیج دیں گے۔ پر ابھی تک تو ملی نہیں۔ شاید عنقریب ہی کسی آنے والے کے ہاتھ آجائے۔''

اُسے بے حد خفّت کا احساس ہوا تھا۔

''کونسا میک تھی۔'' پوچھا گیا۔

''اتنی قیمتی تو نہیں تھی۔ کیمی تھی شاید۔''

''پتہ نہیں یہ احساس اب اُس کے دماغ میں کیوں جگہ لینے لگا تھا کہ اُسے فضول جھوٹی گپوں سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ کھلے دل و دماغ کا پُر خلوص مرد جو پل جھپکنے میں اس کے دل میں جھانک لیتا تھا اُس کے لہجے سے بہت کچھ اخذ کر لیتا تھا۔ وہ اپنے گھر اور افراد

خانہ کو خاص طور پر باپ ماں وغیرہ کو، بہت کم گفتگو میں شامل کرتی تھی۔''

اب یُوں بھی غلط باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔

اُس نے ہاتھ بڑھا کر ٹول بکس میں سے سنہرا ڈبہ نکالا اور اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اِسے دیکھو۔ یہ کیسی ہے؟''

بڑا عجیب سا لگا اُسے۔ وہ گُم سی بیٹھی تھی جب اُس نے کہا۔

''ارے کھولو اِسے۔ مداری کی پٹاری تو نہیں ہے کہ ڈھکن اٹھاتے ہی کوبرا سانپ پھن لہراتا ملے گا۔''

مگر اس نے نہ ڈھکن کھولا اور نہ کوئی بات کہی۔

''کمال ہے یار کیا ہو گیا تمہیں؟'' کھول کر دیکھو نا۔

''میں نے نہیں کھولنا اسے۔''

''اوّل درجے کی احمق لڑکی ہو۔'' کہتے ہوئے اُس نے ڈبا اس کے ہاتھ سے پکڑا۔ اُس کا ڈھکن اُوپر اُٹھایا۔ اندر خوبصورت اور نفیس سی ایک گھڑی جھلملا رہی تھی۔

کار اُس نے ایک طرف پارک کی۔ ڈبا اس کے ہاتھوں سے لیا اور اُس کی کلائی پکڑ کر اپنی طرف کرتے ہوئے بولا۔

''لاؤ میں پہناؤں۔ تمہیں اِس کی اشد ضرورت ہے۔''

اُسے یکدم یوں محسوس ہوا تھا۔ جیسے اندر کوئی آتش فشاں پھٹ گیا ہے۔ اور تابڑ توڑ زلزلوں کے جھٹکے اُس کی ہستی کو فنا کرنے والے ہوں۔ ایک بار نہیں بیسیوں بار اُس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اُس کے معمولی سے جسمانی لمس سے بھی اپنے آپ کو بچاتا ہے۔ اور ناگزیر سی صورت حال کے سوا کبھی اُس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہی وہ چیز تھی کہ وہ

اُس کے نہاں خانہ دل میں بُہت نیچے اتر گیا تھا۔

اُس نے اُس کا خوبصورت ہاتھ کار میں جلتی روشنی میں دیکھا۔دُبلا نازک سا جس کی لانبی مخروطی انگلیاں سُرخ پالش میں ڈوبے ناخنوں کے ساتھ بہت آرٹسٹک لگتی تھیں۔

یکلدم اُس کے دماغ میں کالج کی وہ الٹرا ماڈرن لڑکیاں گھوم گئیں جو آئے دن قیمتی چیزیں پہنا کرتیں۔

کوشی پُراسرار سے انداز میں کہتی۔

بھئی وہ نیلی پیلی کاروں والے گھنٹہ گھنٹہ بھر کالج گیٹ پر ان مہارانیوں کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں تو یہ عنایات اُنہی لوگوں کی ہیں۔یہ زبیدہ اور تہمینہ کے تو فیملی بیک گراؤنڈ سے مجھے پوری واقفیت ہے۔نچلے متوسط طبقے کی لڑکیاں ہیں۔راحت زماں اور آمنہ سعید ان سبھوں کا شمار اسی کلاس میں ہوتا ہے۔بھلا نچلے متوسط اور درمیانے متوسط درجے کے گھروں کی لڑکیاں جن کے بہن بھائیوں کی تعداد بھی ماشاءاللہ سے خاصی ہوتی ہے اور وہ سب خیر سے زیر تعلیم بھی ہوں۔خود سوچو اِن حالات میں لڑکیاں ان اللّے تللّوں کی کہاں متحمل ہوسکتی ہیں۔جب تک یہ اُوپر کی کمائیاں نہ ہو۔

اِس اُوپر کی کمائی کی تفصیلات جان کر تو وہ لرز گئی تھی۔

اور رات کے اِن تاریک لمحوں میں اُس نے دکھ اور کرب سے سوچا۔

میرے متعلق بھی ایسے ہی سکینڈل مشہور ہو جائیں گے۔

وہ تڑپ کر رہ گئی۔

’’نہیں نہیں مجھے یہ نہیں چاہیے۔آپ مجھے کیا اس حد تک زیر بار کرنا چاہتے ہیں کہ میں گردن ہی نہ اٹھا سکوں۔‘‘

اُس کی گلوگیر آواز میں دردناک سی التجا تھی۔

کار کے اندر مدھم روشنی تھی۔ مگر اِس کے باوجود وہ اُس کے چہرے پر پھیلے درد کو بخوبی محسوس کر سکتا تھا۔

مزید اصرار کی بجائے اُس نے خاموشی بہتر سمجھی۔ گھڑی اور کیس دونوں سیٹ پر رکھے اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔ نیوڈھاکہ کی مختلف سڑکوں کے موڑ کاٹتے رہے اور پھر دھان منڈی کے غربی علاقے میں ایک خوبصورت کشادہ سی کوٹھی کے سامنے رُک گیا۔ پھاٹک بند تھا۔

ایک تیز گونج دار آواز میں اُس نے چوکیدار کو بُلایا۔ پھاٹک کُھلا اور وہ اندر آ گیا۔ گاڑی سے اُترتے ہوئے بولا۔

''کچھ دیر کی معافی چاہوں گا۔ یہ جہاں آراء آپا کا گھر ہے۔ کرایے پر اٹھایا ہوا تھا۔ اس ماہ خالی ہوا ہے۔ صبح سے دو بار فون آ چکا ہے کہ ٹی وی روم کی چھت ٹپکتی ہے۔ اِس کی مرمت کا کچھ انتظام کر دوں۔ جہاں آراء آپا کے دونوں بیٹے احتشام اور مستفیض باہر گئے ہوئے ہیں۔

وہ فرنٹ کوریڈور میں پہنچ کر رُک گیا۔ پھر وہیں سے رُخ موڑ کر بولا ''تم یہاں اکیلے کیا کرو گی۔ میرے ساتھ آ جاؤ اور ہاں یہ گھڑی اور کیس اٹھاتی لانا۔''

اِس قدر شاندار گھر تھا کہ وہ دیکھ کر سخت مرعوب ہوئی۔ ٹی وی روم کی چھت کے معائنے سے فارغ ہو کر وہ اندرونی سیڑھیوں کے راستے اُسے چھت پر لے آیا۔

دُودھیا چاندنی، دھان منڈی کے بلند و بالا پرشکوہ گھر، اُن میں اُگے کیلوں اور پپیتوں کے درخت سبھی مل جل کر پُراسرار ماحول پیدا کر رہے تھے۔

وہ چھت کی بیرونی دیوار پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''زندگی اِس قدر مصروف ہو گئی ہے کہ فطرت کی رعنائیوں سے لُطف اندوز

ہونے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ دیکھو تو ۔کس قدر خوبصورت سماں ہے۔

وہ بھی اس کے پاس ہی دیوار پر ذرا سا ٹک گئی۔

کچھ دیر وہ خاموشی سے گھڑی کے سٹریپ کو ہاتھوں سے مسلتا رہا پھر محبت اور شفقت گھلی آواز میں بولا۔

''نجمی تم کہتی ہو۔ میں تمہیں زیر بار کر رہا ہوں۔ کیا تم بتا سکو گی کہ ایسا کرنے سے مجھے کیا حاصل ہو گا۔''

ایک لمحے کے لیے اُس نے گہرا سانس لے کر آنکھیں بند کیں۔ چاند کی چاندنی کا سارا نور اپنے چہرے پر سمیٹا اور پھر جیسے وہ اپنے آپ سے بولی۔

''تم ماحصل کی بات کرتے ہو۔ میں شاید تمہیں کبھی یہ نہ بتا سکوں کہ تم میرے لیے کیا بن چکے ہو؟''

وہ چند دن جو اُس نے اپنی علالت کے دوران اس کے گھر پر گذارے تھے۔ اِن دنوں نے رحمان کی شخصیت کی اُن پرتوں کو بھی نمایاں طور پر اُجاگر کر دیا تھا۔ جو اُس سے پہلے اُس کے سامنے نہیں آئی تھیں۔ اُس کے خلوص اور شفقت سے تو وہ متاثر تھی ہی۔ اُس کے اچھے کردار کی بھی قائل ہو گئی تھی۔

وہ حوصلہ مند، دلیر اور جی دار بھی تھا اس کا اندازہ اُسے اُس شام ہوا جب اُن کی ملاقاتی دو خواتین آئیں۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا اُسے پھل کاٹ کر دے رہا تھا۔ نوکر نے اطلاع دی۔ اُس نے گھبرا کر اُسے دیکھا پر وہ چہرے پر غایت سکون لیے اِسی طرح بیٹھا سیب کاٹتا رہا۔ نوکر کے استفسار پر بولا۔

''بیوقوف ہو۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ یہیں بلا لاؤ۔

وہ گھبرائی۔ سیب کا وہ ٹکڑا جیسے وہ کھا رہی تھی اُس کے حلق میں پھنسنے لگا۔ بمشکل

اُس نے کہا۔

''وہ لوگ کیا سوچیں گی؟ آپ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھائیں اور وہیں بات کریں۔

''کیوں میں مجرم ہوں جو بھاگتا پھروں اور تمہیں اُن سے چھپاؤں۔ بے تکلف ملنے والے لوگ ہیں۔ اہتمام سے بٹھانے اور خاص طور پر اُن کے لیے ڈرائنگ رُوم کھولنے کی ضرورت کبھی نہیں محسوس کی گئی۔ وہ تعزیت کے لئے آئی ہیں۔ طاہرہ کے بارے میں بھی معلوم کرنا ہوگا کہ وہ کب آرہی ہے؟

آنے والی دو خواتین تھیں۔ انہوں نے کڑی نظروں سے اُس کا معائنہ کیا اُس نے تعارف نارمل انداز میں کراویا۔ اپنے عزیز دوست کی بہن بتایا۔ اُس کی بیماری کا تذکرہ کیا۔

وہ جب چلی گئیں۔ تب اُس نے کہا۔

''میں انسانوں سے کبھی خوف زدہ نہیں ہوا۔ ضمیر کی سچائی نہ صرف اطمینان قلب دیتی ہے بلکہ یہ جرأت اور حوصلہ بھی عطا کرتی ہے۔ تمہارے سلسلے میں میرے پاس دونوں چیزیں ہیں۔

اور اُس کی آنکھیں گیلی ہو گئی تھیں۔

یہی کیفیت اُس وقت بھی اُس پر طاری ہوئی جب اُس چاندنی رات میں وہ اس کے پاس بیٹھی تھی اور اپنے آپ سے کہتی تھی۔

میں تو اب یہی کہوں گی کہ تم اگر میرے ساتھ کوئی زیادتی بھی کر جاؤ گے تو اتنا ضرور رہو گا کہ وہ اُونچا مقام جو تم نے حاصل کر رکھا ہے اُس سے گر جاؤ گے پر تم سے نفرت یہ اب میرے بس کی بات نہیں۔

بے کلی کسی لاوے کی طرح اُس کے سینے سے پھوٹی ۔بے اختیار وہ اٹھی اور اس کے قدموں میں جُھک گئی ۔سر اس کے گھٹنوں پر رکھتے ہوئے اس نے رُوندھے گلے سے کہنا شروع کیا تھا۔

آپ سمجھئے نا ۔مجھے خلوص اور اپنائیت کی جو دولت اِس سرزمین پر آپ سے ملی ہے بس وہ قیمتی ہے ۔مجھے اِس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہئیے ۔

''ارے بیوقوف احمق لڑکی ۔''

اُس نے ہنستے ہوئے اُسے اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کر یُوں اٹھایا جیسے وہ کانچ کا ایک نازک کھلونا ہو ۔اپنے بالکل قریب بٹھاتے ہوئے اُس نے پہلی بار اس کے سر کو اپنے شانوں پر رکھا ۔اُس کے گھنے چمکدار بالوں پر اپنا دایاں رُخسار جُھکاتے ہوئے اور اس کے گرد اپنے بازوؤں کا ہالہ بناتے ہوئے وہ بولا تھا۔

''میں تمہارے اِن احساسات کے لیے تمہارا شکر گذار ہوں ۔پر خود سوچو میں نے تمہیں کیا دیا؟ اس چھوٹی سی چیز کے لیے تمہارا واویلا کرنا مجھے ہنسی آتی ہے ۔تمہیں معلوم ہے میں پُورے پاکستان کا پانچواں امیر ترین آدمی ہوں ۔''

میں تمہارے ذہن میں مچلتے ہر احساس سے واقف ہوں ۔شاید تمہارا خیال ہے کہ تمہیں احسان مند کر کے ایک دن میں تم سے اصل بمعہ سُود وصول کر لوں گا۔

دیکھو مجھی میں فرشتہ نہیں ۔اگر یہ کہوں کہ میں ایک اچھا انسان بھی نہیں تو غلط نہیں ۔میری بہت سی دوست لڑکیاں ہیں جن سے میرے تعلقات خوشگوار ہیں ۔فلش بھی کھیلتا ہوں ریس میں بھی کبھی مُنہ ماری کر لیتا ہوں ۔ڈانس بھی کرتا ہوں اور شراب بھی پیتا ہوں ۔میری بیوی سے اگر تم میری بابت رائے پُوچھو تو وہ بہت سی اور باتوں کے ساتھ یہ بھی کہے گی کہ مجھے نظر بازی کی بھی لت ہے جو دراصل نہیں ۔

تم کہو گی کہ میں کسرِ نفسی سے کام لے رہا ہوں اور ہرگز ہرگز ایسا نہیں۔ کیونکہ تم نے میرا جو روپ دیکھا ہے۔ وہ یکسر فرق ہے۔ تم خود فیصلہ کرو کہ ایک بھولی بھالی معصوم سی بے ضرر لڑکی جس نے مجھے اپنے خیالوں کے سنگھاسن پر دیوتا بنا کر بٹھایا ہوا ہے۔ اب میں کیسے جذبات یا ہوس کے ہاتھوں اُس اِتنے اونچے مقام سے اُتر کر حیوان بن جاؤں۔ تم میرے لیے بہت پوتر ہو۔''

باقی رہی یہ گھڑی تم گھر سے دُور ہو۔ طالب علم ہو۔ تمہیں اس کی اشد ضرورت ہے۔ اِسی مقصد کے لیے اِسے خریدا گیا۔ میرے جذبے کو سمجھنے کی کوشش کرو اور بلا وجہ دماغ مت اُلجھاؤ۔''

اور جب وہ کار سے اُتر کر رقیہ ہال کے اندر آئی اور اُس نے آڈیٹوریم کی تیز روشنی میں اپنی کلائی کو دیکھا۔ ستون کے ساتھ ٹک کر اُس نے آنکھیں بند کرلیں اور بے اختیار ہونٹ اُس جگہ چپک گئے۔

جہاں گھڑی بندھی تھی۔

باب نمبر ۲۰:

دوپہر اس قدر ہنگامہ خیز ہوگی۔اُس کے گمان میں بھی ایسا ہونے کا کوئی امکان دُور دُور تک نہ تھا۔اُس کا طوفانی انداز اُسے اندر باہر سے ہلا کر رکھ دے گا۔ یہ تو اُس کے تصور میں بھی نہ تھا۔ یوں اگر اُسے اِس شدت کا تھوڑا سا علم ہو جاتا۔اُس کی چھٹی حس بیدار ہو کر اُسے تھوڑا سا خبر دار کر دیتی۔اُس کا اندر آنے والے واقعات اپنا عکس پہلے سے ہی ڈالنا شروع کر دیتے ہیں کے مصداق اُسے کچھ نہ کچھ کسی نہ کسی رنگ ڈھنگ سے ہلکا سا اشارہ بھی کر دیتے تو کو وہ وقت کے پاؤں میں زنجیریں ڈال کر دوپہر کو آنے سے تو روک نہ سکتی۔ پرناگہانی مصیبت سے بچاؤ کا کوئی سدِ باب تو کرتی۔

مگر ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔یہ بھی کبھی رُکی ہے۔وہ ہوئی اور ایسے ہوئی کہ اُسے یوں ہلا گئی جیسے تیز آندھی کسی درخت کو جڑوں تک کو ہلا دے۔ایک ہی وار پڑا اور سارا تانا بانا بکھر کر رہ گیا۔

صبح تو ذرا بھی غیر معمولی نہ تھی۔عام دنوں جیسی ہی تھی۔ بلکہ اگر کہا جائے تو خاصی خوشگوار سی تھی۔شب خوابی کے لباس میں ہی اُس نے کوریڈور میں نکل کر نیلے شفاف آسمان کو دیکھتے ہوئے اُس کی خوشگواری اور لطافت کو محسوس کیا تھا۔معمول کے مطابق سب کام کیے۔ ناشتے اور تیاری کے بعد وہ یونیورسٹی جانے سے قبل ایک بار پھر کوریڈور میں آ گئی تھی۔فضا کو بھرپور انداز میں پھر دیکھا تھا۔

سُورج چمک رہا تھا۔رقیہ ہال کی روشوں اور قطعوں پر دھوپ بکھری پڑی تھی۔دن روشن اور چمکدار تھا۔ایسا ہی روشن اور چمکدار جس میں دُنیا کو تسخیر کرنے کو جی چاہتا ہے۔نیلے آسمان کو ہاتھوں سے چھونے کی تڑپ جاگتی ہے۔

وہ کوریڈور کی بیرونی دیوار پر کہنیاں ٹکائے ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ تھامے بُہت دیر تک فضا کو دیکھتی رہی تھی۔ ماحول میں خُنکی کا لطیف سا احساس پایا جا رہا تھا۔

آدھ گھنٹہ اُس نے بالوں کو سنوارنے میں لگایا اور تقریباً اُتنا ہی وقت نفیس کڑھت کی اُس کاہی رنگی ساڑھی کو پہننے پر لگایا جسے چند دن پیشتر وہ جناح ایونیو کے گنی اسٹور سے خرید کر لائی تھی۔ ہمرنگ بلاؤز چُست اور اُونچا تھا۔ ساڑھی پر لگی ابرق جگنوؤں کی طرح چمک رہی تھی۔ اُس نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تھا۔ سچی بات ہے پہچاننے میں نہیں آ رہی تھی۔ کھِلتی چمپئی رنگت کی ملاحت دوچند ہو گئی تھی۔

بڑے خوشگوار موڈ میں کوریڈور میں فلاسفی ڈپارٹمنٹ کی رانی سے کچھ دیر گپ شپ لگائی۔ جب لفٹ کی طرف جانے لگی تو وہ ہنستے ہوئے بنگلہ میں بولی۔

''ارے ذرا سنبھل کر جانا۔ آج بُہت سے شہید ہوں گے۔''

وہ کھِلکھلا کر ہنسی اور بولی۔

''ایسی باتیں کرو گی تو ساڑھی پہننا چھوڑ دوں گی۔''

وہ جب بھی ساڑھی پہن کر ہال میں پھرتی یا ڈپارٹمنٹ جاتی۔ لڑکے لڑکیاں سبھی تعریف کرتے۔ بعض شوخ اور چلبلے تو پاس آ کر کہنے سے بھی نہ چُوکتے۔

''بُہت سُندر لگتی ہو۔ بس ساڑھی پہنا کرو۔''

وہ جھینپ جاتی۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا اور وہ تیزی سے رُخ بدل لیتی۔

ڈپارٹمنٹ وہ ضرور گئی۔ کلاسیں بھی اُس نے اٹنڈ کیں۔ لائبریری میں بھی بیٹھی کچھ نوٹس بھی بنائے۔ کام تو سبھی کئے۔ پر ایسے کئے جیسے بیگار کے ہوں۔

دل سینے میں مچل مچل جا رہا تھا کسی طرح وہ دیکھ لے۔ ساتھی لڑکیوں نے احساس دلا دیا تھا کہ وہ آج بُہت خوبصورت لگ رہی ہے۔

بارہ بجے ہال آئی اور کھانا کھایا۔اِدھر اُدھر روشوں پر گھومی۔ٹیبل ٹینس کی ماہر کھلاڑی نسرین حبیب سے تھوڑی دیر باتیں کیں۔کھیل کے قواعد وضوابط کے بارے میں کچھ جانا۔مقصدتو وقت کو دھکیلنا تھا کہ لگتا تھا جیسے دوپہر کو کسی طاقتور جن دیو نے پُھتھی ڈال کر اپنی گرفت میں اِس مضبوطی سے لے لیا ہے کہ وہ ایک جگہ جام ہو کر آگے بڑھنے سے انکاری ہوگئی ہے۔

لفٹ مین سے باتیں کرتی اُوپر اپنے کمرے میں آئی۔آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی۔پندرہ بیس منٹ تک بالوں میں کنگھا چلایا۔ساڑھی کے پلّو کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیا۔ہیر سپرے کیا۔ہونٹوں پر لپ اسٹک کا ٹچ دیا۔ہاتھوں اور ناخنوں کا جائزہ لیا۔پاؤں کو کپڑے سے صاف کیا اور پھر نیچے ڈاک دیکھنے چلی آئی۔

ساری ڈاک دیکھ ڈالی۔ایک بھی خط اُس کے نام نہ تھا۔گھر سے خط آئے کتنے ہی دن گذر گئے تھے۔بددل سی ہو کر آڈیٹوریم کے پیل پائے سے پشت ٹکا کر کھڑی ہوگئی اور لڑکیوں کو اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے دیکھنے لگی جب روم نمبر دس کی مونیکا نے اُس کے قریب آ کر کہا۔

’’ارے تم یہاں کھڑی ہو اور مینو تمہیں ڈھونڈ رہا ہے۔کوئی خاتون تمہاری تلاش میں ہے۔‘‘

’’خاتون۔‘‘

بے اختیار اُس کے ہونٹوں سے نکلا۔

’’خاتون کون ہو سکتی ہے؟‘‘

اُس نے تیزی سے پلکیں جھپکائیں اور اپنے آپ سوال سے سوال کیا اور جب وہ گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی اُس نے اضطرابی لہجے میں خود سے پھر پُوچھا تھا۔یہ کون ہے؟

دل پتہ نہیں کیوں دھڑکنے لگا تھا۔ ریسپشن روم Reception Room کے باہر سیمنٹ کے تھڑے پر تمکنت سے کھڑی اُس بے حد فیشن ایبل عورت کو اُس نے حیرت سے دیکھا تھا۔ جس کی قیمتی ساڑھی کا پلو اُس کے شانے پر اِس انداز میں پڑا تھا کہ بالشت بھر پیٹ ننگا ہو رہا تھا۔ قدرے موٹاپے کی طرف مائل اُس خاتون کے شانوں پر بوجھل سا جوڑا تھا۔ بغیر آستین کا بلاؤز بہت چُست تھا۔

اُس کا دل کچھ اِس انداز میں دھڑکنے لگا جیسے ابھی وہ سینے پر دھرے سارے پردے پھاڑتا باہر آ گرے گا۔ اُس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیں رینگنے لگیں۔ تیکھی اور کڑی نظروں سے اُس لڑکی کو دیکھا گیا تھا۔ جو ابھی ابھی اُس کے پاس آ کر کھڑی ہوئی تھی اور اب اُس کی طرف خوف زدہ استفہامیہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔

''ہوں تو اِس کے ساتھ آج کل رحمان کی شامیں گذرتی ہیں۔''

اُس نے لمبا اور گہرا سانس لیا۔ سینے میں اُٹھتی درد کی ٹیس کو دبایا۔ چند قدم آگے بڑھی اور برچھی کی طرح کاٹ دینے والے لہجے میں بولی۔

''تم یقیناً میرے بارے میں جاننا پسند کرو گی۔ میں مسز رحمان ہوں۔''

''مسز رحمان۔''

الفاظ اتنی مدھم اور شکستہ آواز میں کچھ یوں اُس کے لبوں سے نکلے کہ اُن کی بازگشت بھی اُسے نہ سنائی دی۔

یہ مسز رحمان اُس مسز رحمان سے کتنی مختلف تھی جس کی تصویروں کو اُس نے گیلری میں ٹنگے دیکھا تھا۔ دُبلی پتلی نازک اندام سی لڑکی ایک فربہ خاتون کا رُوپ دھار چکی تھی۔

اُس وقت جب دُھوپ جوبن پر تھی۔ رقیہ ہال کی لڑکیوں کے غول کتابیں ہاتھوں میں پکڑے زور و شور سے آپس میں باتیں کرتے اندر آ رہے تھے۔ گیٹ پر بیٹھا دربان کسی

سائیکل رکشے والے سے اُلجھ رہا تھا۔ مینو دولڑکیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ سامنے پُوکھر کے پاس بیٹھی چند لڑکیاں ٹیگور کے گیت گا رہی تھیں۔

اور وہ فٹ پاتھ پر کھڑی اُس فیشن ایبل عورت جس نے اپنے آپ کو مسز رحمان کہا تھا یوں دیکھ رہی تھی جیسے بستر مرگ پر پڑے کسی مریض کو موت کا فرشتہ نظر آ گیا ہو۔ خاتون نے ایک بار پھر گہری نظروں سے لڑکی کو دیکھا تھا۔ کیسا من موہ لینے والا حُسن تھا۔ معصومیت سے بھرا ہوا۔ زمانے کی چالاکیوں، ہوشیاریوں اور چیرہ دستیوں کے نشانوں سے پاک صاف۔

اور اُس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''وضع قطع اور انداز کسی شریف اور اچھے گھر کی لڑکی کا پتہ دیتے ہیں۔ یوں چُپ چاپ خوفزدہ سی مجرموں کی طرح میرے سامنے کھڑے ہونے کی بجائے یہ میرا سامنا کمال ڈھٹائی اور بے باکی سے بھی کر سکتی تھی۔ گو میں بھی آج معاملہ آر پار کرنے آئی تھی پر قیمت کیا ہوتی اِس سے خوف زدہ بھی تھی کہ کبھی کبھی قیمت کی ادائیگی سخت زمین پر مضبوطی سے کھڑے ہونے کے باوجود ساری ہستی کا شیرازہ بکھیر دیتی ہے۔ بندہ کھیرُ وکھیرُ و ہو جاتا ہے۔

لیکن اِس لڑکی کو دیکھ کر میرا دل کچھ عجیب سا ہونے لگا ہے۔ کیوں؟ شاید اِس کی معصومیت اور بھولا پن دیکھ کر۔

پھر وہ آگے بڑھی۔ اُس نے بازو سے اُسے تھاما اور نرمی سے بولی۔

'' آؤ تھوڑی دیر کے لئے باہر چلیں۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

اور وہ اُس کے پیچھے یوں چلی جیسے کسی مسمریزم کے زیر آ گئی ہو۔ یا جیسے کوئی معمول عامل کے پیچھے چل پڑتا ہے۔

کیسے کربناک لمحات تھے۔ مرنے اور خودکشی کرنے والے حالات تھے۔ ویسی ہی گاڑی تھی۔ اِسی طرح موڑ کٹ رہے تھے۔ اُسی جگہ وہ بیٹھی تھی جہاں روز بیٹھا کرتی تھی۔ پر تب اور اب میں کتنا فرق تھا۔ اِس درجہ سنگین صورتحال کا تو وہ خواب میں بھی تصور نہ کر سکتی تھی۔ مگر اب اُس کا کھلی حقیقت کی طرح سامنا کر رہی تھی یوں کہ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے برف تھے۔ چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی اور دماغ ماؤف تھا۔

اور کلکتہ کے مشہور پنجی خاندان کی بیٹی اور ڈھاکہ کے اُونچے معزز گھرانے کی بہو اُس وقت کار چلاتے ہوئے اپنے شوہر کو دل میں پینتیس ہزار گالیاں نکال رہی تھی۔ عورت ذات ازلی بیوقوف اور پاگل، بھلا اُسے ٹریپ کرنا کونسا مشکل کام ہے؟ بیوی کے ناروا سلوک کی داستان سنائی۔ اُس کے ظلم وستم کے قصے بتائے۔ کہیں اُس کی بے وفائی کی داستان گھڑ لی۔ کہیں اُس کے جھوٹے عاشق پیدا کر لئے۔ کتنے حربے ہیں مرد کے پاس۔ ہمدردیاں سمیٹنے اور محبتیں حاصل کرنے کے۔ عورت تو ممتا کے خزانے لئے سدا ہی بے تاب۔ سدا ہی مرد کو اپنے آپ میں سمیٹنے کے لئے تیار۔

اور پھر رحمٰن جیسے شرانٹ آدمی کے لئے تو بائیں ہاتھ کا کھیل۔ جیون دوبھر کر دیا ہے اِس شخص نے۔ اب کوئی کہاں تک نگرانی کرتا پھرے۔

کار میں چھائی خاموشی ٹوٹی۔ اُس نے سوال کیا تھا۔

''رحمان کی تم سے کیسے ملاقات ہوئی؟''

وہ تو پتھر کی ایک مُورت بنی بیٹھی تھی۔ بے حس وحرکت۔ وجود بس سیٹ پر بیٹھنے کا گنہگار ضرور تھا۔

کچھ دیر بعد دوبارہ وہی سوال دہرایا گیا۔

جواب اِس بار بھی نہیں تھا۔

''کیاتم جانتی ہو؟ رحمان کی فیملی ہے۔''

وہ اِس بار بھی چُپ رہی۔اُس کے ہونٹ یوں بھینچے ہوئے تھے جیسے اُن میں کبھی حرکت پیدا نہ ہوگی۔ہاں البتہ اُس جی چاہتا تھا کہ وہ اُونچے اُونچے بین ڈالے۔زور زور سے روئے۔ چیخ چیخ کر کہے کہ ہاں ہاں میں جانتی تھی۔سب کچھ جانتی تھی۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا؟ میں یہ سب بھلا کب چاہتی تھی؟

اور طاہرہ رحمٰن نے گویا تیز دھار کی چھُریوں سے اُس کا سارا وجود بوٹیوں میں کاٹ دیا۔وہ کہہ رہی تھی۔

''دراصل آج کل کالجوں اور یونیورسٹیوں کی لڑکیو ں نے امیر زادوں اور مالدار مردوں سے دوستی فیشن بنالیا ہے۔بھئی سٹوڈنٹ لائف میں مُفت کے سیر سپاٹے، پکنکیں، کاریں جھولنا، تحفے تحائف وصول کرنا کیا بُرے ہیں۔زندگی میں تھوڑا سا تھرل اور ایکٹویٹی رہتی ہے۔پر میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم جو چہرے مہرے سے ایک اچھے اور شریف گھرانے کی لڑکی لگتی ہو۔تمہیں فلرٹ بازی کے لئے کیا میرا شوہر ہی ملا تھا؟ آج پندرہ دن ہوگئے ہیں میری نیندوں کو اُڑے ہوئے۔کتنے پاپڑ بیلے۔کیسے کیسے جتن کئے؟ تب کہیں جا کر تمہارا کھوج ملا۔میرے شوہر کا دماغ کتنا خراب ہوگیا ہے؟ میں تمہیں بتانا نہیں چاہتی۔ مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ عورت ہو کر میرا گھر لوٹنے کی کوشش نہ کرو۔

یہ الفاظ نہیں ہتھوڑے تھے۔جنہوں نے اُس کے دل و دماغ کے پرخچے اُڑا ڈالے۔پہلی بار اُس نے زبان کھولی۔

''میں نے آپ کے شوہر سے کوئی فلرٹ بازی نہیں کی۔ میں تو ایسا کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔آپ اتنا بڑا الزام مجھ پر مت لگائیں۔''

'' کیسے نہ لگاؤں۔اُس کے دل میں تمہارا راج ہے۔اُس کے دماغ پر تم حاوی

ہو۔تمہارے بارے میں وہ ایک لفظ بھی سُننے کا روادار نہیں۔"۔

"مت کریں ایسی باتیں۔آپ کا شوہراور آپ کا گھر دونوں آپ کو مبارک۔"

"میں چاہتی ہوں تم آئندہ رحمٰن سے کوئی تعلق نہیں رکھوگی۔"

"یہ سب آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں۔اپنے بارے مجھے کیا کرنا ہے؟اِس کا فیصلہ میں خود کروں گی۔یقیناً آپ کے شوہر آئندہ میری صورت نہیں دیکھیں گے۔"

اور جب وہ رقیہ ہال کے سامنے گاڑی سے اُتر رہی تھی اُس نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا اور بولی۔

"میں تمہاری احسان مند رہوں گی۔گھرداری کے چکروں میں پڑوگی تو سمجھوگی کہ یہ کیسے دُکھ ہیں؟جوتن من جلا دیتے ہیں۔

مگر اُس نے نہ تو اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھاما اور نہ ہی اُس کی طرف دیکھا۔ بس چہرے پر زردی لئے شکستہ سی چال چلتی گیٹ کے اندر داخل ہوگئی۔

باب نمبر ۲۱:

ماں کوئی گھنٹہ بھر سے وقفے وقفے سے اُسے آوازیں دیئے جا رہی تھی۔

''اُٹھ نا پُتر۔ تیرے انتظار میں کب سے بیٹھی ہوں تو ناشتہ کرے تو کسی اور کام میں لگوں۔ ابھی مجھے ہانڈی لینے بازار بھی جانا ہے۔ بارہ بجے کھانا تیار نہ ہوا تو ظہیر نے آکر طوفان کھڑا کر دینا ہے۔''

یہ تھوڑی کہ وہ سو رہی تھی اور ماں کی پیار بھری پُکاروں سے انجان تھی۔ وہ تو ماں کے اُٹھنے سے بھی پہلے کی جاگی ہوئی تھی۔ پر وہ یہاں تھی کب؟ وہ تو آنکھیں بند کئے اُس دنیا میں گُم تھی جسے وہ بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ کبھی کبھی آنسوؤں کے قطرے گالوں سے بہتے ہوئے اُس کے ہونٹوں کے کونوں کو چھوتے تو وہ لبوں کو ذرا سا کھول کر اُنہیں پی جاتی۔ منہ میں نمک سا گھل جاتا۔

وہ رات ہی لاہور پہنچی تھی۔ ماں، اُس کے دونوں چھوٹے بھائی اور گھر کے دوسرے افراد اُسے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ اُس نے کوئی اطلاع نہیں دی تھی کسی خط میں اپنے آنے کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔

''کیسے چلی آئیں؟ خیریت تو ہے نا۔ ابھی تو تمہارا پرسوں خط ملا تھا تم نے اُس میں کچھ نہیں لکھا تھا۔''

ماں نے قدرے حیرت سے کہا۔

''ماں آج کل یونیورسٹی میں ہنگامے ہو رہے ہیں۔ طلبہ نے کلاسوں کا بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ بے کار رہنے سے دل گھبرانے لگا تھا۔ میں بُہت اُداس ہو رہی تھی۔ بس سوچا کہ ایک چکر لگا لوں۔''

اُس کے بھائی نے کہا بھی۔

''اخبار اور ٹی وی پر تو ایسی کوئی خبر پڑھنے سُننے کو نہیں ملی۔''

''ہوسکتا ہے حکومت اُسے ہائی لائٹ نہ کرنا چاہتی ہو۔''

وہ پھر بول اُٹھا تھا۔

''تمہیں گھر بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ آرام سے وہاں لائبریری میں وقت گذارتیں۔ پڑھتیں۔ انسان کو ایسا موقع ملے تو بھرپور فائدہ اُٹھانا چاہیے۔''

چھوٹا اِس بات پر پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ خالی ہاتھ لٹکاتے آ گئی ہے۔ چار پانچ بار وہ کہہ بیٹھا تھا اب پھر وہی بات اُس کے ہونٹوں پر تھی۔

''تم کچھ لائیں بھی نہیں۔ وہاں کے کیلے اور اناناس اتنے مشہور ہیں۔ ایک پھل کٹھل کے بارے میں بُہت سُنا ہے میں نے لکھا بھی تھا۔ کم از کم اُسے ہی لے آتیں۔ دیکھتو لیتے۔ یہ ہوتا کیسا ہے؟''

اُسے سخت غُصہ آیا۔ تلملاتے ہوئے اپنے دل میں بولی۔

''دیکھو تو کمبخت کو کیسا ہابڑا پڑا ہوا ہے۔ کوئی پُوچھے مجھے کیلے اور اناناس سُوجھتے تھے۔''

پھر وہ تنک کر بولی۔

''کمال ہے تم اپنے حواسوں میں تو ہو۔ پندرہ بیس کلو کا وزن اُٹھا کر یہاں لاتی اور چیرنے پر پتہ چلتا کہ پھل ابھی کچا ہے تو بتاؤ کتنا افسوس ہوتا؟''

چھوٹے کو اُس سے اِس درجہ کڑوے جواب کی اُمید نہیں تھی۔ اُسے مزید تپ چڑھی۔ جھلا کر بولا۔

''چلو تم کیلے ہی لے آتیں زیادہ نہ سہی۔ تھوڑے ہی ہوتے۔ خالی ہاتھ آنے کا

فائدہ۔‘‘

دونوں کو اپنے اپنے انداز میں اُس کے یوں چلے آنے پر سخت افسوس ہو رہا تھا۔

’’کم بخت کہیں کے ۔اِنہیں کیلوں اور پڑھائی کی پڑی ہے۔کوئی مجھ سے پُوچھے میں تو زندگی کی ہر بازی ہار آئی ہوں۔‘‘

کیسا فوری فیصلہ تھا جو آناً فاناً ہوا تھا جسے کرتے ہوئے اُس نے پل کے لئے بھی اپنے متعلق نہیں سوچا تھا۔چار جوڑے کپڑوں کے بیگ میں ڈالے اور ایرپورٹ پہنچ گئی تھی۔چانس پر سیٹ مل گئی اور وہ اُس دنیا سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر آگئی۔

پر اُس وقت گھر کے اُس چھوٹے سے کمرے میں بستر پر لیٹے ہوئے اُس نے باربار سوچا کہ وہ اب کیا کرے گی؟ لوگوں کو کیا بتائے گی کہ وہ ڈھاکہ سے کیوں چلی آئی؟ اُس کی روم میٹز،وارڈن،ہاؤس ٹیوٹر اور پروؤسٹ وغیرہ کیا خیال کریں گی کہ بغیر بتائے میں کیوں یہاں چلی آئی؟ اُس کے کلاس فیلو لڑکے اور لڑکیاں کتنے حیران ہوں گے؟ کتنی کہانیاں گردش کریں گی؟ کیا کیا قیاس آرائیاں جنم لیں گی؟ مجھے اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے تھا۔کم از کم ہاؤس ٹیوٹر آپا کو درخواست دینی ضروری تھی۔ماں کی بیماری بہانہ بن سکتی تھی۔باپ کا نام لیا جاسکتا تھا۔جب اُسے رحمان کا خیال آیا اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کا اندر غم سے پھٹ کر ابھی باہر آجائے گا۔

ماں نے اِس بار جو آواز دی اُس میں قدرے ڈانٹ بھی تھی۔وہ اُٹھ بیٹھی۔کپڑوں کی سلوٹوں کو ہاتھوں سے ٹھیک کیا۔ڈوپٹہ ڈھنگ سے اوڑھا اور باورچی خانے میں آئی۔کچن جس کی دیواریں دھوئیں سے کالی ہوئی پڑی تھیں۔سلور اور سستی چینی کے برتن باورچی خانے کے طول وعرض میں بکھرے تھے۔چھوٹی سی پیڑھی پر بیٹھی ماں جس کی شلوار پر ہلدی اور چکنائی کے داغ دھبوں نے اُس کا اصل رنگ ہی بگاڑا ہوا تھا۔فلالین کی مہندی

رنگی چادر میلی کچیٹ ہو رہی تھی۔ چھوٹی سی چوبی چوکی پر پلاسٹک کی پلیٹ میں تلا انڈا پڑا تھا۔

چُولہے کی لکڑیوں کے دھوئیں نے صُورت ہی بگاڑی ہوئی تھی۔ پہچاننے میں نہ آ رہا تھا۔ دیسی گھی سے چپڑی ہوئی روٹی کی شکل بھی عجیب سی تھی۔ یا اُسے عجیب لگ رہی تھی۔ تھوڑے سے وقت نے ہی سالوں کی شناسائی کو اجنبیت میں بدل دیا تھا۔ دیگچی میں پڑی چائے کا رنگ سیاہ تھا۔ اُسے ابکائی سی آئی۔ جی چاہا بھاگ جائے۔ پر کہاں بھاگے؟ بیٹھی۔ چائے پیالی میں اُنڈیلی اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ جب وہ خالی پیالی فرش پر رکھ رہی تھی۔ تب اُس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''یہ سب کچھ وہی تو ہے جسے میں بچپن سے دیکھتی چلی آئی ہوں یہ سب میرا مقدر ہے۔ اُنہیں دیکھ کر ابکائیاں کیسی؟ چھ ماہ باہر رہ کر گویا میں اپنی اوقات ہی بھول گئی ہوں۔

ماں برابر کہے جا رہی تھی۔ خالی پیٹ چائے نہیں پیتے بیٹے یہ نقصان دیتی ہے۔ پراٹھا بھی کھاؤ ساتھ۔ یہ انڈا میں نے تمہارے لئے بنایا ہے۔ اِسے بھی چکھو۔ ایسا انڈا تو تمہیں بہت پسند تھا۔

ماں کا یہ سارا رولا گولا اُسے زہر ہی نہیں لگ رہا تھا بلکہ اُس کا خون بھی جلا رہا تھا۔ برداشت کرنا مشکل ہوا جاتا تھا۔ بیٹھی صبر اور ضبط کے کڑوے گھونٹ پیتی رہی اور اِس کوشش میں جُتی رہی کہ کوئی کڑوی اور تلخ بات منہ سے نہ نکل جائے۔

جب اُٹھنے لگی۔ ماں نے پھر کہا تھا۔

''تم بُھوکی ہو۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔''

اور اُس نے کمرے کی طرف بڑھتے بڑھتے رُک کر کہا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ بس میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔''

یہ کیسے اعصاب شکن دن تھے۔ کس قدر خوفناک راتیں تھیں۔ سکون حرف غلط کی

طرح مٹ چکا تھا۔ نیندیں اُڑ چکی تھیں۔ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر بیٹھتی۔ جی چاہتا خودکشی کر لے۔ کبھی اپنے آپ سے کہتی۔

''پاگل پن اور حماقت کی بھی حد کر دی میں نے۔ پچّی اوڑھی اور چلی آئی۔ وہ بیگم صاحبہ اپنے گھر میں ٹھاٹ سے سوتی ہوگی اور میں یہاں اُس مچھلی کی طرح تڑپ رہی ہوں جسے کوئی ظالم پانی سے نکال کر کنارے پر پھینک دے۔''

''بھلا کیوں نہ ملتی میں اُس کے شوہر سے۔ کوئی لالچ تھا مجھے اُس سے۔''

غُصّے کا پارہ اُوپر ہی اُوپر چڑھتا چلا جاتا۔ پر جلدی نیچے بھی آجاتا۔

''میں نہیں جانتی میں نے اچھا کیا یا بُرا۔ یااللہ مجھے سکون دے۔ اِس جان کنی کے عذاب سے نجات دے۔ جس دلدل میں گردن تک دھنس گئی ہے اِس سے نکال۔''

ذہنی انتشار نے اُس کا چمکتا دمکتا رنگ دُھندلا کر رکھ دیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں قبرستانوں جیسی ویرانیوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ سارا دن وہ گھر کے کسی کونے کھدرے میں گھسی کتاب آگے رکھے سوچوں میں ڈوبی رہتی۔ اُلجھنوں میں کھوئی رہتی۔ وہ اُلجھنیں جن کے حل کا کوئی سرا اُس کے ہاتھ نہ آتا۔

ماں اکثر کہتی۔

''اتنی محنت نہ کر کہ صحت کا ہی ناس ہو جائے۔ دیکھو تو رنگ کیسا گہنا گیا ہے۔ سارا سارا دن اور آدھی آدھی رات تک کتابوں سے چپکو گی تو یہی حال ہوگا۔

وہ جب باہر نکل کر اُس کی کسی خالہ یا ممانی سے جب یہ کہتی اللہ ماری کیسی ظالم پڑھائیاں ہیں۔ بندے کو نچوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ ارے میری اتنی خوبصورت اور پیاری بیٹی کیسے جھلس گئی ہے؟

اور یہ سب سن کر اُس کا جی اپنے آپ کو ذبح کر لینے کو چاہتا۔ رات کو جب وہ پاؤ

بھر دودھ سے بھرا چھوٹا سا گلاس لے کر اُس کے پاس آتی تو اُس کا دل اور بھی لہولہان ہوتا ۔

ڈھیر سارے دن گذر گئے تھے ۔ایک دن وہ اپنے آپ سے بولی ۔

''اللہ میرا کیا بنے گا ؟یوں میں کب تک ہلکان ہوتی رہوں گی ۔ بہن بھائی ڈگریوں کے پلندے لے کر آجائیں گے ۔اُونچی جگہوں پر پوسٹ ہوں گے اور میں یونہی بیچ میں ہی لٹکتی رہ جاؤں گی ۔یونیورسٹی جاؤں ۔کچھ بھاگ ڈور کروں شاید امیگریشن کا کچھ سلسلہ ہو جائے ۔مجھے تو شرم آتی ہے جب گھر میں کوئی پوچھتا ہے کہ تم نے کب واپس جانا ہے؟

اِس اُدھیڑ بن میں بھی کتنے دن گذر گئے ۔ایک دن ہمت کر کے گھر سے نکلی ۔ سامنے والے سڑک پر آئی ۔اُس نے تو یونہی نگاہیں اٹھا کر اپنے سامنے اور دائیں بائیں دیکھا تھا ۔سارا ماحول جیسے ایکا ایکی کسی زلزلے کی زد میں آکر ڈولنے لگا تھا ۔محسوس ہوا جیسے وہ چکرا کر بیچ سڑک پر گر جائے گی ۔اب بھلا ایسا کیوں نہ ہوتا ؟

لاہور ڈھاکہ بن گیا تھا ۔سڑک کے پرلی طرف سرمئی گاڑی میں بیٹھا وہ اُسے دیکھ رہا تھا ۔

یہ بصارت کا دھوکہ ہے ۔ہیلوسینیشن Hallucination کی کوئی کیفیت وارد ہوئی ہے ۔پل بھر کے لئے اُس نے سوچا ۔

''نہیں ۔نہیں ۔'' اُس کا مُو مُو چلایا ۔اُس کا دل سینے میں زور سے پھڑ پھڑایا ۔اُس کاغذ کے کسی بدقسمت ٹکڑے کی طرح جو اُڑ کر برقی پنکھے کی زد میں آجائے اور پھڑ پھڑاتے ہوئے اپنی موت کا اعلان کرے ۔

یہ یہاں کیسے؟ ڈوبتے دل سے یہ سوال اُبھر کر خاموش ہونٹوں پر آیا تھا ۔

''اُف ۔گندی مندی غلیظ گلیاں ۔اُن میں بکھرا نچلے متوسط طبقے کا سارا ماحول اُس کے پس منظر کا پُورا رایول کھول رہا تھا ۔اُسے سب کچھ معلوم ہوگیا وہ سب کچھ جان گیا ۔

اُس کا کلیجہ کٹنے لگا۔خجالت اور شرمندگی کا غازہ پیشانی پر چمکنے لگا تھا۔اور پھر اُس کے پریشان دماغ میں ایک خیال نے نشتر لگایا۔یوں بیچ سڑک کھڑی ہوں۔کسی نے دیکھ لیا تو افسانے بنتے دیر کتنی لگتی ہے؟

قدم جو زمین سے چپک گئے تھے۔اُن میں حرکت ہوئی۔آنکھیں جو ایک ہی سمت ٹکی ہوئی تھیں۔اُنہوں نے خوف سے دائیں بائیں دیکھا۔سامنے مونگ پھلی، ریوڑیاں اور ٹافیاں گولیاں بیچتا ایک معمر آدمی دو تین چھوٹے چھوٹے بچوں کو سودا دے رہا تھا۔دودھ دہی کی دوکان والا بھی گاہکوں میں اُلجھا ہوا تھا۔لوگ آجا رہے تھے۔

پھر اُس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے سیدھا چلنا شروع کردیا۔یہ محض اتفاق ہی تھا کہ یہ سڑک کچھ آگے جاکر مین روڈ سے مل جاتی تھی۔اُس کے قدموں میں ایسی تیزی تھی اور وہ اِس رفتار سے یوں اُٹھ رہے تھے جیسے تعاقب میں چور ڈاکو اور بدمعاش ہوں۔

وہ چلتی جا رہی تھی۔تیز تیز گھر کی حدُود سے دُور جانے والوں کی نظروں کی پہنچ سے دُور بہت دُور نکل جانا چاہتی تھی۔

اور گھر سے خاصے فاصلے پر واقع بس اسٹاپ پر ٹھہر کر اُس نے گہرے دُکھ اور یاس سے لبریز ایک نظر اپنے آپ پر ڈالی اور خود سے بولی۔

''یہ میں ہوں ایک میجر کی بیٹی جو ابھی غلیظ اور متعفن گلیوں کا ایک لمبا چوڑا سلسلہ اپنے پیچھے چھوڑ کر آئی ہے۔کس کر گوندھے ہوئے بال اور موٹی ململ کا دوپٹہ جس نے میرے آدھے سر اور آدھے جسم کو اچھی طرح ڈھانپا ہوا ہے میرے فیشن کی پوری داستان کہہ گیا ہوگا۔''

''خدایا میری پریشانیاں پہلے کیا کم تھیں جو ان میں مزید اضافے کے لئے یہ شخص آگیا ہے۔جی چاہتا ہے زمین شق ہو جائے اور میں اِس میں سما جاؤں۔کہیں دور بھاگ

جاؤں ۔"

پر نہ زمین شق ہوئی کہ وہ اِس میں سما جاتی اور نہ ہی وہ کہیں بھاگی کہ اُس کی نظروں سے بچ جاتی ۔

سرمئی مزدا اُس کے قریب آ کر رُک گئی ۔دروازہ کُھلا اور زمین میں غرق ہونے کی بجائے وہ ندامتوں اور شرمندگیوں سے لُتھڑے چہرے کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی ۔

انٹرنیشنل کے عالیشان آراستہ پیراستہ کمرے میں وہ صوفے پر خاموش بیٹھی تھی ۔ قریب ہی بیڈ پر وہ نیم دراز چھت کو دیکھتا تھا ۔اُس نے دزدیدہ نظروں سے اُسے دیکھا ۔وہ بڑا نڈھال اور پریشان نظر آ رہا تھا ۔صحت بھی پہلے جیسی نہ تھی ۔چہرہ اُترا ہوا اور زرد زرد سا تھا ۔

کتنی خاموش ساعتوں کے بعد اُس نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے قریب کیا اور اُس کا سر اپنے سینے پر رکھتے ہوئے بولا ۔

''تم کیسے چلی آئی تھیں ؟ کیا تمہیں مجھے بتانا نہیں چاہیے تھا ؟''

اُس کی آواز میں جو دلی کرب اور غم کی آمیزش تھی ۔اُس نے اُس کی آنکھوں کو بھگو دیا تھا ۔وہ محبت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا تھا ۔کانوں کے پاس بالوں کی بکھری ہوئی لٹوں کو سنوارتا رہا ۔اُس کی موٹی موٹی مضبوط اُنگلیاں کس کر گوندھی ہوئی چوٹی کی لمبائی کا جائزہ لیتی رہیں اور وہ اُس کے بالوں سے پُر سینے پر سر رکھے اُس بچے کی طرح خاموش آنکھیں بند کیے پڑی رہی ، روتی رہی جو چند دنوں کی جدائی کے بعد ماں سے ملا ہو اور جدائی کے دنوں کا کرب اُس کے وجود کے لمس سے زائل کر رہا ہو ۔

اور باہر وقت دھیرے دھیرے گذرتا رہا ۔

دیر بعد اُس کی آواز پھر اُس کے کانوں سے ٹکرائی ۔

''طاہرہ نے تمہارے ساتھ کچھ زیادتی تو نہیں کی۔نجمی اُسے معاف کر دینا کیونکہ وہ اب اِس دنیا میں نہیں۔''

جس سرعت اور تیزی سے تیر کمان سے نکلتا ہے اِسی انداز میں اُس کا سر اُس کے سینے سے اُٹھا تھا۔اُس کی آنکھوں کا پھیلاؤ حیران کن حد تک تھا۔اُس کے لب پھڑ پھڑائے پر اُن سے کچھ بولا نہ گیا۔

اُس نے اُس کی مشکل کو سمجھا اور بڑی دلگیری سی آواز میں بولا۔

''ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔پہلا حملہ ہی جان لیوا ثابت ہوا۔''

تب بمشکل وہ بولی۔

''کب۔''

''آج بارہ دن ہو گئے ہیں۔''

اُس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے تھے۔جنہیں صاف کرتے ہوئے وہ غم سے بوجھل آواز میں اُسے تفصیل بتاتا رہا۔

ایک کانٹا سا اُس کے دل میں چُبھا۔جب یہ سوچ اُس کے دماغ میں آئی۔

''کہیں میری وجہ سے یہ سب نہ ہوا ہو۔''

اِس سے زیادہ سوچنا اُس جیسی حساس لڑکی کے بس کی بات نہ تھی۔ڈوبتے لہجے میں وہ اپنے اِس خیال کا اظہار بھی کر بیٹھی۔

''ارے نہیں پگلی۔اپنے ذہن کو اِن بے کار اندیشوں سے مت گھائل کرو۔طاہرہ بڑے دھڑتے والی بیوی تھی۔وہ ایسی چھوٹی موٹی باتوں کو کب خاطر میں لاتی تھی؟

زندگی کا ہنٹر حیات پر اِس انداز میں برس سکتا ہے کبھی سوچا نہ تھا۔ساحلوں کی خوشگوار اور لطیف ہواؤں میں دنوں کو گذارتے ہوئے سمندر کے پانیوں کا طوفان کی صورت

اُمنڈ پڑنے کا زبانی کلامی ذکر تو ہوتا ہے۔ پر ایک دن اِس میں اُٹھتا طوفان آپ کے گھروندے کو خس وخاشاک کی طرح بہالے جائے گا یہ شاید گمان میں نہیں ہوتا۔ طاہرہ نے گھر میں جنگ وجدل کا بازار گرم کیا۔ بہتان طرازی میں حسبِ معمول انتہا تک پہنچی۔ اپنے مزاج کے مطابق چُپ کا ہتھیار تھا میرے پاس۔ کیا اُس نے سٹریس لیا؟ میں نہیں جانتا۔ گھر کی فضا معمول پر تھی۔ میں البتہ خاموش تھا۔ میری خاموشی کی اُسے بھلا کب پرواہ تھی؟ شاید یہ میری سوچ ہو۔ پر وہ اِس انتہا تک کیوں چلی گئی؟ اُسے کیا خوف تھا؟ یہ وہ ڈھیروں ڈھیر سوالات تھے جو اُس کے سامنے اُٹھتے تھے۔ جن کے جواب بھی اُسے نہیں ملتے تھے۔"

اِس لڑکی کے ساتھ تعلق اتنا گہرا کیسے ہوگیا؟ کچھ اِس کی سمجھ بھی نہیں آئی۔

سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ تقدیر کو جو وہ چاہتی ہے کرنے دو۔ اب اِس لڑکی کو تو واپس لے جانا ضروری تھا۔ ایک تو ڈھاکہ تاریکی اور اُداسی میں لپٹا ہوا۔ اب چھوٹی سی روشنی کی ایک لَو کو بھی بُجھا دوں۔

''یہ تو میرے لئے ممکن نہیں۔''

باب نمبر۲۲:

وہ سُرخ عروسی لباس پہنے بیٹھی تھی۔قیمتی طلائی زیورات بھی اُس کے بدن کی زینت بنے ہوئے تھے۔خوبصورت ہیروں کا بریسلٹ کلائی کا حُسن بڑھا رہا تھا۔نفاست اور عمدگی سے کئے گئے میک اَپ نے چہرے کو چار چاند کا روپ دے دیا تھا۔پورہ بانی ہوٹل کا یہ کمرہ جس میں وہ گاؤ تکئے کے سہارے دبیز قالین پر بیٹھی تھی۔برقی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔

پر بات یہ تھی کہ یہ سب مل جل کر بھی اُس کے چہرے پر پھیلے دُکھ کے احساسات کو چھپانے میں نا کام ہو رہے تھے۔

ابھی چند ہی لمحے گذرے تھے کہ وہ نجمہ شمشیر علی سے نجمہ رحمان بنی تھی۔بیگم سلیم احمد خوند کر۔بیگم جی اے دیوان اور مونیکا داس باتوں میں مگن تھیں۔ثریا اور نازلی البتہ اُس کے پاس بیٹھیں اُس کی آنکھوں سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُمنڈتے پانی کو رُخساروں پر گرنے سے قبل ہی جذب کرنے میں مصروف تھیں۔

ایک ہزار میل دور بیٹھی ماں باورچی خانے میں چولہے پر بڑی سی ہنڈیا چڑھائے ساگ گھوٹ رہی ہوگی۔اُپلوں اور لکڑیوں کا کسیلا دُھواں باورچی خانے میں پھیلا ہوا ہوگا۔اُس کی ناک سے پانی بہتا ہوگا جسے کبھی تو وہ اپنی فلالین کی چادر کے پلو سے صاف کرتی ہوگی اور کبھی زکام زدہ ناک کو چولہے کے آگے ڈھیر کی ہوئی راکھ پر بار بار صاف کر رہی ہوگی۔دونوں چھوٹے بھائیوں نے کالج سے آکر پوچھا ہوگا۔

''ماں آج کیا پکایا ہے؟''

اور ماں سے ساگ کا سُن کر اُنہوں نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا ہوگا۔

''ساگ تو ماں نے ہماری ہڈیوں گوڈوں میں نہ بٹھایا تو بات کیا بنی یا تو سردیاں نہ آئیں اور اگر اُن کا آنا اتنا ہی ضروری ہے تو پھر ابّا کے اِس بے حد پیارے دوست صوبیدار شریف کی فصلیں کورے سے ماری جائیں جو ہر دوسرے دن ساگ کا گٹھا ہمارے ہاں بھجوانا اپنا اولین فرض سمجھتا ہے۔

ماں ساگ میں مکئی کا الن ڈالتے ہوئے اُونچے اُونچے بول رہی ہو گی۔

''تمہیں تو ہر روز گوشت چاہیے۔ مرغی چاہیے۔ بھُنی ہوئی کلیجی چاہیے۔ پھل چاہئیں۔ ساتھ میں پڑھی لکھی ماں بھی چاہیے تھی۔ میں ان پڑھ جاہل عورت جانتی نہیں کہ تمہارے جسموں کی بڑھوتری کے لئے اچھی غذاوں کی کتنی ضرورت ہے۔ باپ فوج میں کرنیل لگا ہوا ہے نا۔ پیسے کی اُگل اُچھل ہے۔ آئے دن اُس کے منی آرڈر آتے ہیں اور میں پیسہ اپنے پچھلوں کو دے آتی ہوں۔ کبھی کہوں کہ حساب لو مجھ سے میں مہینہ کیسے پورا کرتی ہوں؟ وہ تو ڈیڑھ سو روپیہ بھیج کر فارغ ہو جاتا ہے۔ اُس کی بلا سے گھر کی گاڑی چلے یا رُکے۔ پائی پائی سوئی کے ناکے سے گذارتی ہوں تب کہیں مہینہ پار ہوتا ہے۔

''ارے چھوڑ ماں۔ تو تو سدا یونہی واویلا کرتی رہے گی۔ اب بڑی آپا اور بڑے بھیا بھی پیسے بھیجنے لگ گئے ہیں۔ پر تو تو جانے اُنہیں کس کال کوٹھری میں چھپا ڈالتی ہے۔ ہوا تک نہیں لگنے دیتی۔''

اور ماں نے یقیناً بات ٹال دی ہو گی اور کہا ہو گا۔

''ارے ظہیر دیکھ نا گلاس میں خط آیا رکھا ہے۔ بتا تو کس کا ہے؟ مجھے تو نجمہ کا لگتا ہے اور ہاں مجھے سنا بھی دے۔''

''ماں تو نے چار حرف پڑھ تو لینے تھے۔ یہ خطوں کو سُننے کی محتاجی تو جاتی رہتی۔''

''ارے اب سنائے گا یا یونہی باتیں بناتا رہے گا۔''

اور یہ یقیناً اُس کا خط ہوگا جو دو دن قبل اُس نے پوسٹ کیا تھا۔ سُنتے سُنتے ماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ہوگا۔

''میرے بچے بکھر گئے ہیں۔ مولا تو ہی اُن کا نگہبان ہے۔ اُنہیں کامیاب کر اور گھر لوٹا۔''

کیا ماں کو ایک لمحے کے لئے یہ خیال آیا ہوگا کہ اُس کی بیٹی اِس وقت ڈھاکہ کے ایک بے حد اُونچے ہوٹل کے عالی شان کمرے میں دُلہن بنی بیٹھی ہے۔

اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دردناک سسکی اُس کے لبوں سے نکلی اور آنسوؤں کا ڈھیر رُخساروں پر بہہ گیا۔ اُوشا اُٹھ کر فوراً اُس کی طرف لپکی۔

''ارے ارے پاگل ہوگئی ہو۔ جانتی ہو رحمان بھائی نے مجھے خاص طور تمہیں سجانے کے لئے مدُعو کیا ہے۔ تمہاری آنکھیں جن کی نوک پلک سنوارنے میں میں نے دو گھنٹے صرف کئے ہیں۔ یوں آنسو بہا کر اُن کا ستیاناس مت کرو۔ وہ جس کے لئے اتنی تگ ودو کی گئی ہے اُسے تو کم از کم دیکھ لینے دو تا کہ میری محنت وصول ہو۔

مسز دیوان نے اُسے گلے سے لگا کر پیار کیا اور بولیں۔

''دیکھو جان یوں فکر کرنے اور رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ شادی تو ہر لڑکی کی ہوتی ہے پر رحمان جیسا شوہر کہیں نصیب سے ہی ملتا ہے۔

''شادی۔''

اُس نے زیرِ لب دہرایا۔

بھلا ایسے بھی کبھی شادیاں ہوئی ہیں۔ ڈھولک بجتی ہے۔ مہندی لگتی ہے۔ رشتہ دار اور عزیز اکٹھے ہوتے ہیں۔ باجے بجتے ہیں ایک ہنگامہ برپا ہوتا ہے۔ پھر شہنائیوں کی گونج میں سارے شگن و بیہاروں کے ساتھ دلہن رخصت ہوتی ہے۔

اُس کی شادی یوں چُپ چپاتے پردیس میں ہو جائے گی کہ جنم دینے والے ماں باپ کو خبر نہ ہوگی۔ بہن بھائیوں، عزیزوں، رشتہ داروں، کسی کو بھی علم نہ ہوگا۔

''میرا تو ناطہ ٹوٹ گیا نا اُن سے عمر بھر کے لئے کٹ گئی۔''

کچھ ایسی انہونی اور نرالی بات بھی نہ ہوئی تھی۔ وہ جس راستے پر چل نکلی تھی۔ اُسے یہیں آ کر ختم ہونا تھا اور یہی اُس کا انجام تھا۔ ہاں البتہ یہ اور بات تھی کہ رحمان نے اِس موضوع پر اُس سے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔

وہ اُسے جب لاہور سے لے کر ڈھاکہ آیا تو سیدھا اپنے گھر لے گیا۔ اِس تمام وقت وہ اِسی اُدھیڑ بن میں رہی کہ وہ اُس سے کوئی بات کرے گا۔ یہ کس نوعیت کی بات ہو سکتی ہے؟ وہ قیاس آرائیاں میں ڈوبی رہی۔ لیکن وہاں سب باتیں تھیں۔ اِدھر اُدھر کی لیکن اگر ہونٹ چُپ تھے تو وہ خاص اِس موضوع پر۔

شام ڈھلی تو اُسے ہال چھوڑنے آیا۔ راستے میں اُس نے صرف اتنا کہا۔

''نجمی تمہارا لوکل گارجین اب میں ہوں۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ تم فضول قسم کی شرم اور جھجھک میں اُلجھی رہو۔ اوّل تو تمہاری سب ضروریات کا خیال میں خود ہی رکھوں گا۔ تاہم اگر اِس سلسلے میں کوئی فروگذاشت ہو جائے تو یاد دلانا تمہارا فرض ہوگا۔ مجھے خوشی ہوگی اگر تم ہر بات بلا تکلّف مجھ سے کرو گی۔ اپنی تمام تر توجہ پڑھائی پر صرف کرو اور اُس کمی کو پورا کرو جو اِس عدم موجودگی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

اُس نے نیو مارکیٹ سے اُس کے لئے کھانے پینے کی اشیاء خریدیں۔ روزمرہ ضروریات کی دیگر اشیاء کی بھی خریداری ہوئی۔ بعض چیزوں کے بارے میں اُس نے بہتیرا کہا کہ وہ اُس کے پاس ہیں۔ مگر اُس کی ایک نہ چلی اور جب وہ گاڑی سے اُتر رہی تھی۔ اُس نے یہ کہنا نہایت ضروری سمجھا تھا۔

''مکمل اعتماد سے اندر جاؤ۔لڑکیوں سے ملو۔تمہاری پروسٹ کو میں مطمئن کر چکا ہوں۔اُنہوں نے تمہاری روم میٹز کو تمہاری اچانک غیر حاضری کے بارے میں یقیناً بتا دیا ہوگا۔

اور ہال پہنچ کر لڑکیوں سے مل ملا کر اُنہیں اپنی والدہ کی بحالیٔ صحت کا بتا کر وہ عجیب سی سوچوں میں گھر گئی تھی۔

''یہ کیسا انسان ہے؟'' اُس نے بے اختیار سوچا تھا۔

اور پھر کتنے مہینے گزر گئے وہ پریویس سے فائنل میں آ گئی۔اب بھی اکثر وہ اُسے شام کو ہال سے پک کرتا۔گھماتا پھراتا۔کبھی کبھی گھر لے جاتا۔دونوں اکٹھا کھانا کھاتے۔کافی پیتے۔باتیں کرتے۔دونوں بچے اُس نے مرزا پور کے بی ہومز میں بھیج دیئے تھے۔کبھی کبھی وہ کہتی۔

''مجھے بچوں سے تو ملا یئے۔میں نے تو اُنہیں دیکھا بھی نہیں۔''

وہ ہنستا اور کہتا۔

''بہت شیطان ہیں۔تمہارے گلے کا ہار بن جائیں گے۔''

وہ بہت حساس،متین اور فرمابردار قسم کی لڑکی تھی۔کسی چیز کی فرمائش کرنا تو اُس کے نزدیک گناہ کے برابر تھا یہ اور بات ہے کہ اُس کے چیخنے اور رواویلا کرنے کے باوجود بھی وہ اُس کے لئے تھوک کے حساب سے چیزیں خریدتا تھا۔

اور جب اُسکا انٹرنیشنل پاسپورٹ بنوانے کی بات ہوئی۔اُسنے حیرت سے کہا۔

بھلا اس کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے کہاں جانا ہے؟

اور اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

تمہارے،بہن بھائی باہر ہیں۔کبھی جانا ہو تو مسئلہ نہیں ہوگا۔

اُس کے اکاؤنٹ میں بھی چھ ہندسوں کی آخری حد کو پہنچی ہوئی رقم تھی ۔ یونہی ایک بار چیک کرنے پر لاکھوں کا بیلنس جان کر دنگ ہی تو رہ گئی تھی ۔اُس نے سخت اعتراض کیا ۔کتنے دنوں اُس سے ناراض رہی ۔پر وہ مُصر کہ بیکار کی ضدمت کرو ۔کبھی ضرورت پڑ سکتی ہے ۔

اُس کا فائنل بھی اختتام پر تھا ۔حالات میں جیسے ٹھہراؤ اور استقامت سی آئی ہوئی تھی ۔یوں اب بھی وہ اُسے ہال سے پک کرتا ۔لمبی ڈرائیو پر لے کر جاتا ۔خوب گپ شپ لگتی ۔کبھی کبھی گھر بھی لے جاتا ۔چائے کافی چلتی ۔باتیں ہوتیں ۔

سچ تو یہ تھا کہ وہ شاہزادیوں جیسی شان سے رہ رہی تھی ۔پر ایک عجیب سی بات تھی کہ کبھی کبھی اُس کا جی چاہتا کہ وہ اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹے ۔اُس کی پیشانی پر پیار کرے ۔اُس سے اظہارِ محبت کرے ۔

پر وہ تو انسان ہو کر بھی دیوتا بن گیا تھا ۔گوشت پوست کا وجود رکھتے ہوئے بھی پتھر کا رُوپ دھار بیٹھا تھا ۔

نمی سے بوجھل ہواؤں کے شانوں پر لہراتی وہ شام بہت دلآویز تھی ۔وہ دوپہر سے رحمان کے گھر تھی ۔شام گہری ہونے لگی تو اُسے ہال جانے کے لئے کہا ۔وہ اُسے رخصت کرنے باہر آیا ۔برآمدے کی سیڑھیوں سے پورٹیکو میں کھڑی گاڑی میں بیٹھنے کے لئے جب وہ دھیرے دھیرے نیچے اُتر رہی تھی اُس کا ایک قدم زمین اور دوسرا قدم سیڑھی پر تھا ۔جب اُس نے کہا ۔

''ہم کل دوپہر کا کھانا چائینز میں کھائیں گے ۔''

اُس نے اپنی لانبی پلکیں اُوپر اُٹھائیں ۔قدرے حیرت سے اُسے دیکھا اور بولی ۔

''کل ۔کل سے تو رمضان شروع ہو رہا ہے اور میں نے روزہ رکھنا ہے ۔''

اُس نے بالکل اُس کے قریب آ کر محبت کی گہری نظروں سے اُسے دیکھا اور کہا۔
''مگر بھی یہ دن تمہاری پڑھائی کے لئے بُہت اہم ہیں۔روزہ تو ٹھیک نہیں رہے گا۔''

وہ خفیف سی ہنسی ہنسی۔

''دراصل عادت ہے روزے رکھنے کی۔نہیں رکھوں گی تو بے چین رہوں گی۔''

وہ ہال آ گئی تھی۔اب اکثر اُسے ڈرائیور لاتا اور لے جاتا تھا۔پر جب رات کو وہ عشاء کی نماز سے فارغ ہوئی تو مینو اُس کے لئے ٹفن باکس لایا۔اُس نے تعجب سے پکڑا۔کھولا تو پتہ چلا کہ اُس کی سحری ہے اور پھر یہ معمول بنا کہ افطاری اور سحری دونوں اُس کے ذمے ٹھہریں۔

اُس کی نس نس رگ رگ میں اُس کی محبت اور اُس کا خیال خون کی مانند دوڑنے لگا تھا۔کبھی کبھی اُسے غصہ بھی آتا کہ وہ اُس سے اپنے دل کی بات کیوں نہیں کرتا تھا۔اُس کی سوچیں کیا ہیں؟وہ کیا چاہتا ہے؟

اُس کی سوچوں کا انکشاف اُس پر اُس دن ہوا جب وہ ڈیڑھ بجے لیبارٹری سے اپنے فائنل امتحان کا پریکٹیکل کرنے کے بعد نکلی۔

''وہ گاڑی میں اُس کا منتظر ہے۔'' کوریڈور میں کھڑا ڈرائیور بتاتا تھا۔

وہ اُس کے ساتھ ساتھ چلتی گاڑی تک پہنچی۔سٹیرینگ کو دونوں ہاتھوں میں تھامے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

ڈرائیور کو اُس نے جناح ایونیو میں اُتار دیا اور اُسے لے کر اُ گلو میں آ گیا۔اندر میز کے گرد بیٹھ کر اُس نے ویٹر کو کافی لانے کے لئے کہا۔کافی کا ایک کپ اُس نے اُس کی طرف بڑھایا اور دوسرا خود اُٹھاتے ہوئے بغیر کسی تمہید کے بولا۔

''نجمی میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آج ہی۔''

جیسے قریب ہی کوئی دھماکہ ہو جائے۔ اُس کے شور و دہشت سے دماغ ماؤف ہو جائے۔ کان سُننے سے محروم ہو جائیں۔ کچھ ایسا ہی اُس کے ساتھ بھی ہوا۔ وہ سُن سی ہو کر رہ گئی تھی۔

اُس سے کچھ سُننے کی متمنّی وہ ضرور تھی۔ مگر کیا؟ اُس کا تجزیہ وہ کبھی نہ کر پاتی۔ اب جبکہ سُن بیٹھی تھی۔ تو پریشان ہو گئی۔ دل اور دماغ دونوں بے قابو سے ہو رہے تھے۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے۔

اُس نے محسوس کیا۔

بصد اصرار اُسے کافی پلائی۔ پھر اُسے ساتھ لے کر جیولرز کی دُوکان پر گیا۔ زیورات خریدے۔ بنگال کی مروجہ روایات سے ہٹ کر اُس نے اُس کے لئے غرارہ سیٹ کا انتخاب کیا۔ اِس تمام وقت اُس نے اُسے ایک لمحے کے لئے بھی تنہا نہیں چھوڑا۔ وہ کسی پتھر کی مورتی کی طرح یہ سب دیکھتی رہی۔ رات پڑنے پر وہ اُسے پوربانی لے آیا جہاں اُس کے چند دوست اور اُن کی بیویاں موجود تھیں۔ ثریا اور نازلی ڈرائیور کے ساتھ آئی تھیں۔

ماں، باپ، بھائی، بہن، رشتہ دار خیالوں میں دوڑے چلے آ رہے تھے۔ رشتہ داروں کے طعنے ماں باپ کی جھکی گردنیں اُسے تڑپا گئیں۔

اور پھر جیسے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ یوں تڑپ تڑپ کر روئی اور سسک سسک کر بلکی کہ اُن سب کو اُٹھنا پڑا اور ساتھ کے کمرے سے رحمان کو آنا پڑا۔

باب نمبر ۲۳:

یہ شب و روز افسانوی سے، رُومانوی سے اور گلیمرس سے بھرے پُر ے تھے۔

صبح جب وہ تیار ہوکر خود کو قد آدم آئینے میں دیکھتی تو وقتی طور پر سب کچھ بھول جاتی۔لباس کی خوبصورتی پر نظریں نہ ٹھہرتیں۔جوہرات کی چمک آنکھوں کو خیرہ کرتی۔نک سک سے آراستہ اُسے اپنا آپ بعینہٖ کتابوں میں لکھی ہوئی کسی شہزادی کی مانند نظر آتا۔

جب وہ کمرے سے باہر نکلتی تو ایک حسین اور رنگیلی دنیا اُسے خوش آمدید کہنے کو تیار ملتی۔سڑکوں پر چلتے فٹ پاتھوں پر پھرتے لوگوں کو دیکھ کر اُسے یاد آتا کہ ایسی ہی گاڑیوں میں تمکنت سے بیٹھی بیگمات کو کبھی وہ بہت حسرت سے دیکھا کرتی تھی اور اپنے آپ سے کہتی تھی۔

''اِنہوں نے کونسی ایسی نیکیاں کی ہیں۔ان کے کون سے ایسے کام ہیں کہ جن کے عوض اللہ نے خوش ہوکر انہیں عیش وعشرت کے سامان اور رنگ وروپ کی فراوانیاں عنایت کر دی ہیں۔اور ہم جیسوں نے کیا گناہ کیئے ہیں؟ جو سڑکوں اور ٹوٹی پھوٹی بسوں میں خوار ہونا ہمارا مقدر بنادیا۔

اس کے چھوٹے سے دماغ کی یہ چھوٹی سی بے تکی سوچ بچپن سے ہی اُس کے ساتھ چلتی چلتی بڑی ہوئی تھی اور اس وقت اُس کے سامنے کھڑی اُس سے پوچھتی تھی اور وہ جواب میں کہتی تھی۔کیا وہ ایسی ہی نیکیاں تھیں جیسی اُس نے کی ہیں اور کر رہی ہے۔

یہ شادی جس انداز میں ہوئی تھی۔ اُس نے اُس کے اندر ڈر خوف اور احساسِ جُرم کو جنم دیا تھا۔گو ان پُر تعیش لمحات میں یہ جذبے پوری طرح اُبھر نہ پاتے کیونکہ وہ ان دنوں ہنی مون کے لئے ہانگ کانگ آئی ہوئی تھی۔نئی دنیا اپنی تمام تر دلفریبیوں کے ساتھ

اس کے سامنے تھی ۔راتیں حسین اور دن خوبصورت تھے۔

تاہم جب بھی اُسے گھر والوں کا خیال آتا ۔جب بھی یہ سوچتی کہ وہ کیا کر بیٹھی ہے؟ کلیجے پرچُھری سی چل جاتی ۔وہ تین بار رحمان کے سینے پر سر رکھ کر بُری طرح روئی تھی۔

کبھی وہ بڑے عجیب وغریب سے خواب دیکھتی کہ جیسے وہ اپنے گھر میں ہے۔اپنے چھوٹے سے کمرے میں ۔چارپائی پر ماں باپ بیٹھے ہیں ۔افسردہ اور پریشان سے۔صحن میں رشتہ داروں کا ایک جمگھٹا ہوتا ۔وہ ایک مجرم کی طرح سر جُھکائے اُن کے سامنے کھڑی ہوتی ۔سیاہ کپڑوں میں ملبوس اُس کی دادی اُسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتی۔ بھائی چمکتی دھاروالی چُھری سے اُسے ذبح کرنے اٹھتا۔ماں کی درد بھری آواز اس کے کانوں میں گونجتی۔

اِس نے ہماری عزت خاک میں ملادی ہے۔

تب اُسے جھرجھری سی آجاتی۔

راتیں اوپیرا اور بیلے دیکھنے، کلچرل شوز سے لُطف اندوز ہونے اور کلبوں میں گزرتیں۔دن گھومنے پھرنے ساحل پر چہل قدمی اور مختلف لوگوں سے ملنے ملانے میں بیتا۔یہ وہ جادوئی سحر سے بھرے ہوئے شب وروز تھے کہ جنکے رنگوں کے بارے میں وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی۔

اور یوں پُورے پچیس دن گذار کر وہ ایک سہ پہر تیج گاؤں کے ہوائی اڈے پر اُتری۔گھر پہنچ کر سب سے پہلا کام مثریا کوفون کرکے صورت حال سے آگاہی کا حصول تھا۔

جانے سے پہلے وہ اُس کے ذمہ یہ کام سونپ گئی تھی ۔کہ وہ کبھی کبھار ہال جا کر اس کی ڈاک دیکھتی رہے۔خط کو کھولنے اور پڑھنے کی بھی تاکید کر گئی تھی ۔اور یہ بھی اُسے کہہ گئی تھی کہ اگر کوئی خط جواب طلب ہوتو اُس کے بارے میں اپنی طرف سے لکھ بھیجے کہ وہ ایک

وفد کے ساتھ اہم مقامات کی سیر کے لئے گئی ہوئی ہے۔

یہ جاننے پر کہ اس کا کوئی خط نہیں آیا۔وہ قدرے مُطمئن سی ہوگئی پرتھوڑی سی تشویش کا احساس بھی ہوا۔کیونکہ عام طور پر اُسے ایک ماہ میں اپنے بہن بھائیوں یاماں باپ کی طرف سے تین چار خط ضرور مل جاتے تھے۔

یونیورسٹی کے بارے میں چند باتیں ہوئیں۔ثریا نے اُس کے ٹرپ کے بارے میں پُوچھا۔تھکی ہوئی آواز میں اس کا جواب تھا کہ بس ٹھیک رہا۔

اور جواباً ثریا نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔

''کیابات ہے؟تم تو بڑی ڈیپرس سی لگتی ہو۔دیکھو میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ اب اپنا ماضی بھُول جاؤ۔حال میں نہیں رہوگی تو تمہاری زندگی جہنم بن جائے گی۔''

وہ چُپ چاپ اُسے سنتی رہی۔پھر دھیرے سے بولی۔

اچھا ثریا ملیں گےتو باتیں ہوں گی۔

اب جانے بیٹھے بٹھائے یہ خیال اس کے دماغ میں کیکر کے درخت کی شاخوں پر لگی سولوں کی طرح کیوں چُبھنے لگا تھا کہ رحمان اپنی پہلی بیوی سے بھی ایسے ہی پیار کرتا ہوگا۔اس کے لئے بھی اُس کے انداز میں ایسا ہی والہانہ پن اور فریفتگی ہوتی ہوگی اور اگر کل کلاں اُسے کچھ ہوگیا تو وہ کسی اور کے ساتھ شادی کرے گا اور اس کے ساتھ بھی یہی سب ہوگا جو اُس کے ساتھ ہو رہا ہے۔

کِس قدر خوف ناک خیال تھا جس نے سر سے لیکر پاؤں تک اُسے سُلگا ڈالا۔ایک بھانبڑ مچا دیا تھا۔جی چاہتا اُس سے پُوچھے۔پر مصیبت تو یہ تھی کہ یہ پُوچھنے کا حوصلہ کہاں سے لاتی؟وہ تو اُن لمحوں میں بھی اُس سے کُھل کر بات نہ کرپاتی جب اُس کے قریب ترین ہوتی۔وہ اکثر اصرار کرتا کہ وہ آخر اتنی خاموش کیوں رہتی ہے؟کھل کر باتیں

کیوں نہیں کرتی؟ اور وہ ایک خفیف سی ہنسی کے ساتھ اس کے اعتراض کو ٹال دیتی۔

انہیں ڈھاکہ آئے ابھی چند دن ہی گذرے تھے۔ جب رحمان کو دفتری کام کے سلسلے میں کھلنا جانا پڑا۔ ان دنوں وہ باہر نہیں جانا چاہتا تھا۔ گلشن میں اُس کا نیا گھر تیار ہو چکا تھا اور وہ جلد ہی وہاں شفٹ ہونے کا خواہش مند تھا۔ نجمہ کو ڈرائیونگ بھی سکھا رہا تھا۔ پر مجبوری تھی۔ جائے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نئے گھر کی آرائش کے سلسلے میں وہ اُسے ضروری ہدایات دے کر چلا گیا۔

اگلے دن جب شام کو نجمہ نئے گھر اُن سب اُمور کا جائزہ لینے کے لئے آئی کہ اُسے اِس کی آرائش وزیبائش کے لئے کیا کچھ کرنا ہے؟ اس گھر کو وہ پہلی مرتبہ نہیں دیکھ رہی تھی۔ کئی بار یہاں آ چکی تھی۔ اِس کے کمروں میں گھوم پھر چکی تھی۔

پر پتہ نہیں کہاں سے یہ خیال اٹھا اور اُسکے وجود کو افسردہ ملول کرتا جیسے ہر جگہ ٹھہر سا گیا۔ مرنے والی نے پتہ نہیں کن ارمانوں سے بنایا ہوگا۔ اُس کی کیا کیا خواہشات ہوں گی؟ اُس نے کیسے کیسے خواب دیکھے ہوں گے؟ اِس کی ڈیکوریشن کے لئے جانے کیا کیا منصوبے اُس کے ذہن میں ہوں گے؟ کسی کے خوبصورت گھر کو دیکھ کر اُس نے یقیناً اپنے آپ سے یہ کہا ہوگا۔

''نئے گھر کو میں اسی انداز میں سنواروں گی۔''

پر کیا وہ جانتی تھی کہ اس گھر میں اُسے قدم رکھنا نصیب نہ ہوگا۔ اس کے خواب پل بھر میں کانچ کے کسی برتن کی طرح چکنا چور ہو جائیں گے۔ اس کا شوہر جسے خود تک محدود رکھنے کے لئے وہ بھاگی پھرتی تھی۔ اس کے بچے جنہیں اُس نے منتوں مرادوں کے بعد حاصل کیے تھے۔ سب کسی اور کے پاس چلے جائیں گے۔

اُس کی آنکھیں گیلی ہوگئی تھیں۔ یہ گیلی آنکھیں رفتہ رفتہ شدت احساس سے

بھیگنے لگی تھیں اور پھر وہ بیک یارڈ کے کوریڈور کے پیل پائے سے چمٹی زار، زار روتی تھی۔

اور جب آنکھوں میں بہانے کے لیے کچھ باقی نہ رہا تب اُس نے روندھے ہوئے لہجے میں اپنے آپ سے کہا تھا۔

''ہم اور ہمارا تحفظ موت کے سامنے کتنا بے معنی ہے۔''

اُس کے اپنے زخم رسنے لگے تھے۔

''اللہ میں کیا بننے آئی تھی اور کیا بن بیٹھی ہوں میں کیا زندگی کے کسی موڑ پر اُن چاہنے والوں کا سامنا کر سکوں گی۔''

"یقیناً نہیں۔"

اگلا ہفتہ اُس کا بہت مُصروف گذرا۔کہیں بازار کے چکر کہیں کلر ایڈوائزری سروس کے ماہرین سے مشورے، کہیں نوکروں سے مغز کھپائی۔وہ رحمان کے آنے سے پیشتر گھر پوری طرح ڈیکوریٹ کر لینا چاہتی تھی۔

اور پھر ایک شام جب شفق پھول رہی تھی۔اُس نے روپہلی غرارہ سیٹ پہن کر گیٹ پر رحمان کو نئے گھر میں خوش آمدید کہا۔اپنے بازوؤں میں اُسے کسی قیمتی شے کی طرح سنبھالے وہ اُس کے ساتھ ساتھ ایک کمرے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کی طرف چلا۔

جب وہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے لیونگ رُوم میں آئے۔رحمان چونک اٹھا تھا۔چہرے کا رنگ بدل گیا اور قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔سامنے طاہرہ کا پوٹریٹ تازہ پھولوں سے سجا رکھا تھا۔

ٹکٹکی باندھے وہ اُسے دیکھتا رہا اور اس کے پاس ہی خاموش اور اُداس سی وہ بھی کھڑی رہی۔

''اسے یہاں تم نے رکھا ہے۔''

''ہاں''

اُس کی آواز گلوگیر سی تھی۔

باب نمبر ۲۴:

شاید تمہیں یاد ہو، شاید کیا یقیناً یاد ہوگا۔ آپا مختاراں کی شادی میں دیہاتی عورتیں لوک گیت گا رہی تھیں ۔سفید سوت کے بان سے بنی ہوئی چارپائی پر بیٹھی میں یہ لوک گیت سنتے ہوئے سوچ رہی تھی اور اپنے آپ سے سوال کرتی جارہی تھی ۔

''اِن گیتوں میں سوز ہے یا گانے والیوں کی آواز غم انگیز ہے ۔دل کیسا ڈوبا جاتا ہے؟''

اُس وقت میرا یہ بھی دل چاہا تھا کہ میں اُن کے پاس جا کر اُن کی منّت کروں۔ کہوں کہ از راہِ کرم وہ یہ گیت نہ گائیں ۔پر میں نے سوچا کہ میں یہ بات کیسے کہہ سکتی ہوں کہ وہاں موجود ڈھیر سارے لوگ جو کالے ،سفید، سرخ اور نیلے سوت کی رنگین پایوں والی چارپائیوں پر بیٹھے اُن سے لطف اندوز ہو رہے ہیں کیا کہیں گے؟

بلکہ میں تو یہ بھی دیکھتی تھی کہ بعض معمر عورتیں جھومتی ہوئیں اپنی بے سُری آوازوں کو اُن میں ملانے کی کوششوں میں جی جان سے مگن تھیں ۔تو پھر میرے لیے یہ بہتر تھا کہ مجھے اگر کوئی چیز ناپسند ہے تو میں اُٹھ کر یہاں سے کہیں اور چلی جاؤں۔ پر میں چاہتے ہوئے بھی کہیں نہ جا سکی ۔وہیں بیٹھی اِسے سُنتی رہی ۔

عین اُس وقت تم بھاگتی ہوئی میرے پاس آئی تھی اور تم نے پوچھا تھا۔

''آپا یہ کیا گا رہی ہیں؟''

''مجھے ابھی بھی یاد ہے کبھی تمہارے پیازی ہونٹوں پر اپنی اُنگلیاں پھیرتے ہوئے اور کبھی تمہاری سرخ اوڑھنی کو تمہارے سر پر سجاتے ہوئے میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یہ کہتی ہیں۔''

''لعنت ہے اِن بیٹیوں پر اُن کے جنم پر، اُن کی پیدائش پر، جنہوں نے اپنے اُونچے والدین کا نام بدنام کیا اور سو بار آفرین ہے اُن پر اور اُن کے جنم پر، اُن کی پیدائش پر جنہوں نے اپنے غریب والدین کو بڑا بنایا۔

تم نے مجھ سے بہت سارے سوالات بھی کئے تھے۔ اِن سب کے جواب میں میں نے کہا تھا جیسے ہماری نجمی بہت لائق فائق ہو کر، بُہت اچھی بیٹی بن کر ابا کا نام روشن کرے گی۔

تمہیں اُس گیت کے بول تو بھول چکے ہوں گے پر میں یاد دلاتی ہوں۔ لو سنو۔

نج جو منڈریاں نی جہناں خان نوائے

جم جم جمن نی جہاں خان سدائے

تمہارا خط مجھے پرسوں ملا تھا۔ دن تو خیر منحوس نہ تھا بلکہ اگر یہ کہوں کہ مقامی لوگوں کے بقول بُہت مُبارک تھا تو غلط نہ ہوگا۔ کئی دن کے گاڑھے بادلوں کے بعد کہیں دُھوپ نکلی تھی۔ میرا اُس دن اپریشن ڈے تھا۔ ہر آپریشن کے دن میں صبح صلوۃ التسبیح ضرور پڑھتی ہوں اور اللہ تعالٰی سے خصوصی مدد کی دُعا مانگتی ہوں۔ تین خطرناک آپریشن کئے جو کامیاب رہے۔ سر فریڈرک اور دیگر سینئر ڈاکٹروں نے بڑی حوصلہ افزائی کی۔ ابا کا خط ہسپتال کے پتے پر ہی ملا۔ اُن کی خیریت کا پڑھ کر دل کو سکون ہوا اور جب میں ایک مصرُوف دن گذار کر ہوسٹل آئی تھی۔ میری پیاری جاپانی دوست جیوٹ ٹوٹوری Tottori جو کہ جزیرہ جاپان کا ایک ساحلی شہر ہے میں کوئی دو ہفتے اپنے گھر گذار کر آئی تھی۔ بُہت خوش تھی۔ چہرے پر تازگی تھی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''تو اماں کے پاس بیٹھ کر مزے مزے کے کھانے کھائے ہیں۔ تمہارا چہرہ سب بتا رہا ہے۔'' جیوٹ کِھلکھلا کر ہنسی تھی۔

مجھے معلوم تھا۔اُس کی بیوہ ماں ہماری ماؤں کی طرح اُس سے کتنی بھری ہوئی تھی۔ ہنستی ہوئی وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئی جہاں حسبِ عادت بولتے ہوئے ''تم تو بہت مصرُوف رہی ہوگی۔پڑھا بھی خوب ہوگا۔پڑھا کو تو تم بہت ہو۔اپنی ماں سے میں نے تمہارے بارے میں ڈھیروں ڈھیر باتیں کی ہیں۔وہ بھی تمہاری دوست بن گئی ہے جیسے وہ میری ہے۔''

اُس نے وارڈروب کھولی تھی۔ایک پیکٹ نکالا تھا۔اُسے میرے بازوؤں میں تھمایا۔میں نے تعجب سے بھری ہوئی ایک نظر پیکٹ اور دوسری اُس پر ڈالی تھی۔وہ ہنستی آنکھوں کے ساتھ کہتی تھی کہ یہ تحفہ اُس کی ماں نے میرے لئے بھیجا ہے۔میں بہت خوش ہوئی تھی۔اُس کا شکریہ ادا کیا۔اپنے کمرے میں آئی۔پیکٹ کھولا تو ایک قیمتی گاؤن اور جاپانی کمونو دیکھنے کو ملے۔میں نے خود سے کہا تھا۔

''لو یہ تام جھام مجھے کہاں پسند ہیں؟ دفعتاً مجھے تمہارا خیال آیا سوچا کہ تمہیں بھیج دوں گی۔تم ایسی چیزوں کی خاصی شوقین ہو۔''

اور اُسی دن مجھے تمہارا خط ملا تھا۔ایک بار پڑھا۔دماغ چکرایا۔دوسری بار پڑھا۔

''ارے تم نے کہیں مجھے اپریل فول تو نہیں بنایا۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

مگر یہ اپریل فول والے دن کب تھے؟ یہ دن تو ایشیا کے لوگوں کے لئے بڑے Realistic سے ہیں۔

میں اپنے کمرے سے نکل کر بالکونی میں آ کھڑی ہوئی۔دن بہت خوبصورت تھا۔ پر میرے لئے یہ خوبصورتی ایک ایسے کرب میں بدل گئی تھی کہ جس نے مجھے بے کل کر دیا تھا۔ یہ نہیں کہ میں تمہیں سمجھتی نہیں۔تمہارے اندر اپنے ماحول سے متعلق باغیانہ

خیالات اپنی غربت پر جلنے کڑھنے کے جذبات ہمیشہ سے میرے علم میں ہیں ۔ میں نے اِسے ہمیشہ تمہارا بچپن، جذباتی پن، چھوٹی ہونے اور ہر بچہ ایک جیسا نہیں ہوتا جیسے احساسات کا حامل خیال کیا۔ یہ سوچا کہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ذہنی پختگی آتی جائے گی ۔ میں دقیانوسی بھی نہیں پر اپنی روایات سے ضرور جڑی ہوئی ہیں ۔

اور یہ جڑنا مجھے پسند ہے۔

اِن دنوں ذہنی اذیت کی کن کربناک سوچوں کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہوں ۔ اُن کی تیزی اور تندی کی ہلکی سی جھلک بھی تمہیں نہیں دکھا سکتی۔ بس ایک خواہش باربار میرے سینے میں مچلتی ہے کہ کاش تم میرے سامنے ہوتیں تو تم سے پوچھتی کہ تم نے ،ایک بار سوچا کہ تمہارا بوڑھا باپ اولاد کا مستقبل سنوارنے کے لئے کتنے سالوں سے جسم پر فوجی وردی پہنے گھر سے دور پہاڑوں میں دھکے کھا رہا ہے ۔تمہیں اپنی ماں کے پیوند لگے کپڑوں سے لہسن اور پیاز کی بُو بھول گئی ہے ۔یقیناً تم نے خوبصورت کپڑوں اور خوشبوؤں سے اپنی سوچوں کا سودا کرلیا ہے نا ۔اُس کے چہرے پر چھائے تفکرات کے بادل بھی تمہیں یاد نہ ہوں گے اور ہاں تم یہ بات بھی فراموش کر بیٹھی ہوں گی کہ وہ کام کرتے کرتے جب اپنے گھردرے اوربدرنگے ہاتھوں کو اُٹھا کر کہتی ہے۔

اللہ تو میرے بچوں کو نیک رکھیو اور انہیں کامیاب کیجیو ۔

تم مجھے بتاؤ کہ تم نے اُس عورت اور تیزی سے سفید ہوتے سر والے اُس مرد کو اس قابل چھوڑا کہ وہ برادری میں سر اُونچا کرسکیں ۔ یہی سُنیں گے نا۔ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ لڑکیوں کو زیادہ پڑھانا اچھا نہیں ۔دیکھ لیا نا نتیجہ۔

کتنا اچھا ہوتا اگر تم گاؤں کے اُس چھپڑ میں جہاں تم اپنے بچپن میں ایک بار ڈوب گئی تھی اور تمہیں ڈیڑھ گھنٹے کی کوشش بسیار کے بعد نکالا گیا تھا۔ اُسی وقت مر جاتیں۔

تمہیں ہوا کیا؟ پہلے تعلیم تو مکمل ہونے دیتیں۔ایک بچوں والا شخص جو یقیناً عمر میں تم سے کہیں بڑا ہوگا۔تم نے اپنی زندگی کو اتنا سستا اور ارزاں کردیا۔

شادیاں تو ہوتی ہیں۔کنوار کوٹھے منزل پر پہنچ جائیں ایک کمرے میں زندگی گانے والوں کو ایک اچھا گھر اور مقام تو دے لیں۔اُس فرض سے عہدہ برآ تو ہوجائیں جو اچھی اور صالح اولاد کی صورت ہمارے کندھوں پر دھرا ہے۔

اُس کے جانے کے بعد اُس نے کھولا۔پڑھا اور آنسوؤں کے اِس سمندر میں گری جس میں غوطے کھاتے ہوئے اُسے رحمٰن نی شام کو آفس سے آنے کے بعد نکالا۔

تمہیں اپنی بہن کو کچھ لکھنے سے پہلے مجھ سے مشورہ کرنا چاہیے تھا۔دیکھو نجمی میں تمہارے کچھ بتائے بغیر جانتا ہوں کہ تم احساس جرم کی کس آگ میں جل رہی ہو۔تم نے میرے لئے جو کچھ کیا میں اُس کے لئے تمہارا احسان مند ہوں۔وہ خاموش ہوگیا تھا۔دیر بعد پھر بولا تھا۔

نجمی میں تو یہ جان ہی نہ سکا کہ تم کب میرے دل کی وہ دھڑکن بن گئی تھی جو اگر خاموش ہوجائے تو سانسوں کی زنجیر کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔

باب نمبر ۲۵:

چیزوں میں جاذبیت اور کشش شاید اس وقت تک رہتی ہے۔جب تک کہ اُنکا حصول دسترس سے باہر ہوتا ہے۔پر جونہی وہ مل جائیں۔روزمرہ زندگی میں اُنکا عمل دخل شروع ہوجائے۔تو پھر اُن کی کشش ختم ہوجاتی ہے۔اہمیت کم ہو جاتی ہے۔سب کچھ روزمرّہ زندگی کا حصّہ لگنے لگتا ہے۔

وہ جو کبھی شاندار گھروں کے پاس سے گذرتے ہوئے حسرت سے انہیں دیکھا کرتی۔کاروں میں جُھولتی عورتوں کو دیکھ کر مارے دُکھ کے اپنی قسمت کا ماتم کیا کرتی۔اب جب ایک خوبصورت آراستہ پیراستہ گھر اُسے نصیب ہوگیا جس میں وہ کسی مہارانی کی طرح رہتی تھی۔نوکر چاکر تھے۔ایک چھوڑ دو دو گاڑیاں تھیں۔چاہنے والا شوہر تھا۔سبھی کچھ تھا۔پر پھر بھی کوئی چیز اندر ہی اندر کانٹے چلی جاتی تھی۔بس سکون نہیں تھا۔

کبھی وہ اپنے آپ سے کہتی۔

''زندگی اپنی روٹین پر آگئی ہے شاید اسی لیے میں بوریت کا شکار ہورہی ہوں۔

صُبح بُہت سویرے اٹھنا معمول تھا۔لاکھ وہ اُسے کہتا۔

"کیا مصیبت پڑی ہے تمہیں اتنی جلدی اٹھنے کی۔"

پر وہ اُس کے حصار سے نرمی اور سہولت سے نکل آتی۔نماز پڑھتی۔بھیگی آنکھوں سے سکون قلب کی دعا مانگتی۔ڈریس اَپ ہوکر کچن کا جائزہ لیتی۔اور جب رحمان کی آنکھ کُھلتی وہ کرسی پر چُپ چاپ کسی دیوی کی مانند بیٹھی اُسے نظر آتی۔آنکھ کُھلنے کے ساتھ وہ اس کے لیے چائے کا کپ بناتی۔

خوشبودار چائے اور پیاری سی من موہنی بیوی۔وہ مُسکراتا اس کی طرف محبت پاش

نظروں سے دیکھتے ہوئے ہاتھ بڑھاتا اور اُسے اپنے قریب تر کر لیتا۔

خانساماں ناشتہ تیار کرتا اور وہ اس کے کپڑوں کا جائزہ لیتی۔اس کے دن بھر استعمال کی تمام چیزیں نکال کر قرینے سے رکھتی اور پھر ناشتے کی میز پر آ جاتی۔ناشتہ لگانے میں خانساماں کی مدد کرتی۔اسی دوران وہ تیار ہو کر میز پر آ جاتا۔اکثر وہ اُسے کہتا۔

''تم اتنی بھاگ دوڑ کیوں کرتی ہو۔نوکروں سے کام لیا کرو۔''

اس کی آواز میں دھیما پن ہوتا جب وہ کہتی۔

''مجھے بیکار بیٹھنے کی عادت نہیں۔''

''کمال ہے یار میں کب کہتا ہوں تم بیکار رہو۔بس میرے ساتھ میرے سامنے،میرے قریب رہا کرو۔''

اور وہ ہنس پڑتی۔

''یہ بھی کوئی کام ہے۔''

''جناب یہ سب سے بڑا کام ہے۔''

وہ اس کی ٹھوڑی کو پکڑ کر جھٹکا دیتا۔

''تم اُکتا جاتی ہو شاید۔''

اور وہ فوراً اپنا سر نفی میں ہلاتی۔چہرے پر اثر انگیز تاثرات کی دھوپ چھاؤں ہونے لگتی۔اِس چھاؤں میں اُبھرتی،ڈوبتی گم ہوتی نمایاں ہوتی وہ اس کے سینے پر اپنا سر ٹکا دیتی اور بوجھل آواز میں یہ بھی کہتی۔

آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ایسا کیوں کہتے ہیں؟اور آپ کے ذاتی کام کرنے مجھے اچھے لگتے ہیں۔

اور وہ جُھکتا۔اُس کی پیشانی پر اُس کا یہ جھکاؤ نہ صرف طویل ہوتا بلکہ اِس میں

شفقت اور محبت کی حلاوت اتنی زیادہ ہوتی کہ وہ بہت دیر تک اپنے آپ کو اِس سحر سے نہ نکال سکتی۔

ہمیشہ وہ اُسے اپنے ساتھ ناشتہ کرواتا اُس ماں کی طرح ٹھونس ٹھونس کر کھلاتا جسے اپنے بچے کے کم خوراک ہونے کا ہر وقت گلہ سا رہتا ہو۔

پونے نو بجے وہ آفس چلا جاتا۔ گیٹ پر اُسے رخصت کرنے کے بعد وہ واپس آتی اور گھر کی صفائی میں جُت جاتی۔

پر کبھی کبھی وہ اپنے آپ سے کہتی۔

''تو کیا یہی میری منزل تھی؟''

چیزیں اٹھا اٹھا کر صاف کرواتے وہ خود سے کہتی۔

''خدایا تو نے مجھے اتنا حساس کیوں بنایا۔ یہ سوچیں کس قدر زہریلی ہیں ہر روز میں ان کے زہر سے ادھ موئی ہوتی ہوں۔ ہر نئے دن کوئی نیا خیال میرے دماغ میں کسی کیڑے کی طرح کلبلانے لگتا ہے۔ یہ کیڑا اتنی شدت سے کاٹتا ہے اور اس قدر اچانک حملہ کرتا ہے کہ دفاع کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

وہ کبھی ٹی وی لاؤنج میں کبھی بیڈ روم میں صوفے پر آنکھیں بند کئے اپنے آپ سے باتیں کرتی۔ ایسے لحات میں اس کا جی چاہتا کہیں بھاگ جائے۔ ماں کے دامن میں جاکر چھپ جائے۔ بھائیوں سے جی کھول کر باتیں کرے۔ اُونچے اُونچے قہقہے لگائے۔ ماں کو ستائے اور اُن سے بچپن کی طرح مذاق کرے۔ پھر جی جان سے اپنی کتابوں میں گُم ہو جائے۔

تب وہ زار زار روتی اور خود سے کہتی۔

''یہ کیا ہو گیا؟ ایسا تو میں نے کبھی نہیں چاہا تھا۔ خوابوں خیالوں کا کیا ہے اگر کبھی

میں نے کوئی ایسا سپنا دیکھا تھا تو اس کا یہ مطلب کب تھا کہ میں حقیقت میں بھی ایسا ہی چاہتی ہوں ۔قدرت نے بھی کیسی ستم ظریفی کی ۔حالات کو کیسا موڑ دیا۔کبھی کسی وقت کے دیکھے ہوئے پل بھر کے وقفے کا خواب تعبیر کا روپ پانے میں کیسی سبقت لے گیا۔

آنکھیں آنسوؤں کے ہار پروتی رہتیں ۔

''میں نے بڑی آپا کو کتنا دُکھ دیا؟ وہ کب تک اِس خبر کو چھپا ئیں گی؟''

ایسی باتیں کبھی چُھپتی ہیں؟ اللہ میں نے تو ماں باپ کے ماتھوں پر کالک تھوپ دی۔اپنے بچوں کو قابلیت اور علم کے جس فخر نے انہیں برادری میں ممتاز کیا اُس پر تو پانی پھر گیا نا۔

پر میں بھی کیا کروں۔

اصل میں میرا مقدر ہی خراب ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو بھی میں نے کب سکھی رہنا تھا؟ ایک سُلگن تو جان کے ساتھ چمٹ گئی تھی نا ۔رحمان میری رگ رگ میں بس چکا تھا۔اس سے علیحدگی میرے بس کی بات نہیں تھی ۔اس سے جُدا ہونا ایسا ہی تھا جیسے مچھلی کو پانی سے نکال کر کنارے پر پھینک دیا جائے۔اب یہ اُسکی موت کا سامان ہی تو ہے۔

دونوں میں سے کسی ایک کی قربانی مجھے دینا ہی تھی۔پر اگر کاتب تقدیر مجھ سے پُوچھتا۔اگر یہ کہیں میرے امکان میں ہوتا تو میں اپنی خواہشات وجذبات کو بھینٹ چڑھا دیتی ۔رحمان کی بیوی نہ مرتی اور نہ یہ سب ہوتا ۔

شاید یہ میری کمزوری تھی کہ میں نے اُس کی خواہش کے سامنے سر جُھکایا پر اگر حقیقت کے قلب میں جھانکوں اور غیر جانبداری کے ترازو میں خود کو تو لوں تو یقیناً اعتراف کروں گی کہ میں بھی ایسا چاہتی تھی ۔میں اُس کے لمس کی لذت سے آشنا ہونا چاہتی تھی ۔اس کی چوڑی چھاتی پر سر رکھنے اور اُس کے بازوؤں میں سمانے کی خواہش رکھتی تھی ۔

مجھے اپنی اِس خواہش اِس کمزوری کا اعتراف ہے۔

کبھی کبھی وہ مسز حیدر کے پاس چلی جاتی۔چالیس سالہ مسز حیدر جن کے میاں جیوٹ کے بہت بڑے بزنس میں تھے۔وہ بھی تو ایسے ہی مسئلے کا شکار تھیں۔

مسز حیدر کوئی ڈیڑھ ماہ ہوا اِس کالونی میں شفٹ ہوئی تھیں۔بہت سال وہ نارائن گنج میں رہیں۔اس کے گھر کے ساتھ ہی ان کا محل نما گھر تھا۔بہت ملنسار اور محبت والی خاتون تھیں۔خاصی دوستی ہوگئی تھی۔شاید جلد گھل مل جانے کی ایک وجہ دُکھوں کی سانجھ کا بھی رشتہ تھا جو اُن کے درمیان پہلی ملاقات میں ہی قائم ہوگیا تھا۔

وہ باریسال کے بہت اونچے ٹھاکر گھرانے کی بیٹی تھیں۔پاکستان بنے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا۔یہی کوئی دوتین سال ہوئے ہوں گے باریسال گرلز ہائی سکول میں کلچرل شو ہو رہا تھا۔مہمان خصوصی شہر کے ڈی۔سی مسٹر آر کے دُرّانی تھے۔مسٹر حیدر ڈپٹی کمشنر کے جگری یار تھے اور اُن کے ساتھ ہی شو دیکھنے آئے تھے۔اُس نے پُوجا کا رقص کیا۔رقص کیا تھا۔اُس کے اعظاء نے شاعری کی تھی۔گیت سُنایا تھا۔بے شمار لوگوں نے یہ شاعری سُنی اور دیکھی۔اُسے سراہا مگر حیدر صاحب دل ہار بیٹھے۔

ملاقاتیں۔اظہار آتش شوق و محبت کا، ولولے دل ناہنجار کے سب اُسے سنائے اور بتائے۔

عشق جُنون کی صورت اختیار کر گیا تھا۔اور پھر اتنے بڑے گھر کی بیٹی نے وہی کیا۔جس کے بارے میں صحیح یا غلط کی آرا حتمی ہو ہی نہیں سکتیں۔عشق کی اِس ڈور کے مصنفین اپنے اپنے نظریات کے مالک ہیں۔کوئی دوسرے کا نقطۂ نظر سُننے اور سمجھنے کو تیار نہیں۔

وہ ڈھاکہ بھاگ آئی اور یہاں مسلمان ہو کر اُس نے مسٹر حیدر کے ساتھ شادی کر لی۔بھائیوں نے حیدر کو مار ڈالنے کی دھمکی دی تو اُس نے تنتنا کر انہیں پیغام بھجوایا۔جو تم

لوگوں نے میرے پتی کو نقصان پہنچایا تو یاد رکھنا میں کلکتے کے بازار میں جا بیٹھوں گی اور کوٹھے پر جلی حروف میں لکھ دوں گی۔

میں مہندر ٹھاکر کی بیٹی ہوں۔

اتنا ہی کافی تھا۔غیرت والے تھے نا۔چُپ ہو کر بیٹھ گئے۔آج سوچتی ہوں تو من بھر آتا ہے کہ میں کتنا بڑا انیائے کیا۔ایک پتی کے لیے ماتا پتا بہن بھائیوں سبھوں کو بھینٹ چڑھا دیا۔ماتا تو اسی غم میں سورگباش ہو گئیں۔پتا جی سننے میں آیا ہے زندوں سے بدتر ہیں۔

ایک بات کہوں یاد رکھنا جو کچھ ہو گیا ہے اُس پر پچھتاوا بیکار ہے پچھتاوے جیون کو جہنم بنا دیتے ہیں۔قسمت کے لکھے کو ٹالا نہیں جا سکتا۔اِسی کو تقدیر جانو اور ہنسی خوشی رہو۔کہ رو رو کر حالات کو بہتر نہیں بتایا جا سکتا۔

باب نمبر ۲۶:

رحمان کے دونوں بچے چھٹیاں گذارنے گھر آرہے تھے۔رات کو کھانا کھاتے ہوئے اُس نے کہا۔

''بی ہومز کی پرنسپل کا خط آج آفس آیا تھا۔بچے درگاپُوجا کی چھٹیاں گذارنے کل دو بجے آرہے ہیں۔لیکن ایک مسئلہ درمیان میں پیدا ہوگیا ہے۔راجشاہی جانا ہے۔راجشاہی میں بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگز ہیں۔دو دن کا پروگرام ہے۔جانا شدید مجبوری ہے۔بچے بھی تم سے پہلی مرتبہ ملیں گے۔میرا ہونا بھی ضروری تھا۔

باتیں کرتے کرتے اُس نے شامی کبابوں کی پلیٹ اٹھائی۔بھات پر ایک کباب رکھتے ہوئے بچوں والی بات درمیان میں ہی چھوڑ کر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''خانساماں تو نیا نہیں۔پرانا ہے بلکہ خاصا پرانا ہے۔مگر یہ اتنا لذیذ کھانا کیسے بنانے لگ گیا ہے۔یقیناً تم ہدایات دیتی ہونگی۔''

وہ ہنس پڑی تھی۔کچھ بولی نہیں پر دل میں ضرور بولی۔

''کمال ہے مجھے کہاں طریقہ سلیقہ ہے ایسے پکوانوں کا۔ہمارے گھر میں کونسے مرغ مسلّم روسٹ ہوتے تھے۔یا چائنیز پکتے تھے۔سیدھا سادا کھانا۔اور وہ تو باورچی خانے میں صرف کھانے کیلئے ہی جایا کرتی تھی۔سارا کام تو اماں نے سنبھالا ہوا تھا۔''

اُسے ہنستے دیکھ کر وہ بولا۔میں تمہیں مکھن نہیں لگا رہا ہوں اور نہ ہی مذاق کر رہا ہوں۔

یوں لگتا ہے جیسے چیزوں میں اپنی محبت کا بھی اضافہ کر دیتی ہو۔لطف آتا ہے کھا کر۔مجھے اب باہر کھانا مزہ نہیں دیتا۔

اُس کے پیازی ہونٹوں پر جو مسکراہٹ بکھری تھی اور اس کی آنکھوں میں جو جذبات اُبھرے تھے۔دونوں نے اُسے یہ صاف صاف بتایا تھا کہ پکانے میں فن کا کمال نہیں البتہ محبت کا کمال ضرور ہے۔

کھانا ختم کرنے کے بعد ہاتھوں کو واش بیسن پر دھوتے اور انہیں خشک کرتے ہوئے اُس نے پھر اُسے مخاطب کیا۔

''ڈرائیور اسٹیشن سے بچوں کو لے آئے گا۔ذرا شرارتی ہیں۔گھبرانا نہیں۔بس دو تین دن کی بات ہے۔''

باتیں کرتے کرتے وہ رُکا۔فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔اُس نے سُنا۔دفتر سے متعلق کچھ باتیں کیں۔ریسیور رکھا اور اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''ہمارے بیڈ روم کے ساتھ والا کمرہ اُن کے لیے ٹھیک رہے گا۔اُسے سیٹ کروا دینا۔''

وہ خاموشی سے اُس کی باتیں سُن رہی تھی۔بالکل اُسی انداز میں جیسے کوئی تابعدار شاگرد اپنے اُستاد کی یا کوئی عقیدت مند اپنے پیرومرشد کی باتیں سُنتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ وہ کچھ دل گرفتہ سی بھی تھی اور اپنی اس دل گرفتگی کے بوجھ کو کم کرنے کے لیے اپنے آپ سے کہتی تھی۔

یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔تکلف سے بھری ہوئیں۔بچے تو شرارتی ہوتے ہیں۔مجھے تو خود تیز طرار شرارتی بچے پسند ہیں۔اور پھر یہ اُن کا گھر ہے،بن ماں کے بچے۔

اُس کا دل بھر آیا۔چہرے پر دُکھ کی ایک لہر سی لہرائی۔رحمان نے یہ سب دیکھا۔وہ قدرے متعجب سا ہوا۔اپنے آپ سے بولا۔

یہ بچوں کے آنے سے خوش نہیں ہے۔مگر اسے یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہیے

کہ میں ایک باپ بھی ہوں۔

اور جب وہ بیڈروم کی طرف بڑھ رہا تھا اُس نے رُخ پھیر کر اُسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

نجمی رحیم سے کہو کافی بیڈروم میں لے آئے۔

بستر پر اپنے آپ کو گراتے ہوئے اُسے قدرے تھکن کا احساس ہوا۔آفس کے بکھیڑے بھی انسان کو آدھ موا کر ڈالتے ہیں۔آج کلب جانے کا بھی خیال تھا وہاں وہ چوکڑی انتظار میں ہوگی۔اب تو پینے پلانے کے شغل کو بھی ڈھیر سارے دن گذر گئے ہیں۔اصل میں بات یہ ہے کہ میں اِس نازک سی حساس لڑکی سے ڈرنے لگا ہوں جو کبھی مجھ سے کوئی گلہ شکوہ نہیں کرتی۔آدھی رات کو ڈرنک کرکے نیم بے ہوشی کی حالت میں گھر آیا اور زبان سے کوئی اُلٹ پلٹ بات نکل گئی یا کوئی الٹی سیدھی حرکت ہوگئی تو اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔وہ طاہرہ ہی تھی۔پہاڑ جتنے دل گردے والی جو اگلی صبح بڑے دُھوم دھڑ کے سے لڑائی کا اعلان کرتی تھی۔دنوں ناراض رہتی۔گھر پر ہمہ وقت محاذ آرائی کے بادلوں کو منڈلائے رکھتی۔سوبار خوشامدوں کے بعد کہیں موڈ درست کرتی اور گھر کے دروازے خوش دلی سے کھولتی۔

وہ کافی بنارہی تھی جب اُس نے کہا۔

''آپ لیٹ گئے ہیں۔''

''نہ لیٹوں۔وہ ہنسا۔بھئی تھوڑا سا آرام ضروری تھوڑا سا ایمان کی تازگی ضروری۔اب کہو کیا کہتی ہو۔''

''کافی تو پی لیں۔''اُفوہ''۔وہ اٹھ بیٹھا۔

اُس نے کافی کا گھونٹ بھرا اور بولا۔

''ہاں تجھی کلب چلتی ہو۔'' اُس نے انکار میں سر ہلایا۔''

''یار تم نے گھر میں رہ کر کیا کرنا ہے۔''

''کئی دنوں سے میں تمہیں باہر بھی نہیں لے جا سکا۔ بیگم خوند کر تمہارا پُو چھ رہی تھیں۔ میرا بھی چکر لگ جائیگا۔ خاصے دن ہو گئے ہیں کلب کی شکل دیکھے۔ یار لوگ طعنہ دیتے ہیں کہ بھابھی نے لگام ڈال دی ہے۔''

لفظ بھابھی بڑا عجیب اور نامانوس سا محسوس ہوا۔

''خدایا ذہن آخر اِس صورت حال سے مطابقت کیوں نہیں کر لیتا۔ ہر نیا لفظ مجھے اجنبی کیوں محسوس ہوتا ہے؟''

اُسے کسی خیال میں گم دیکھ کر وہ ہنسا۔

''مراقبے میں جانے کی عادت چھوڑ دو۔ تیار ہو جاؤ۔ ہاں صمد و سے کہو گاڑی میں پڑا پیکٹ نکال لائے۔''

''میرا دل نہیں چاہتا جانے کو۔ آپ ہو آئیے۔''

''ہرگز نہیں۔ میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ تم میرے ساتھ چلو گی۔''

ڈرائیور پیکٹ لایا۔

''کیا کھولوں۔'' جیسی استفہامیہ نظروں سے اُسے دیکھتے اور اُس کی محبت پاش نظروں کو اثبات میں ہلتے دیکھ کر پیکنگ کی چیڑ پھاڑ کے بعد بہت خوبصورت چھوٹے چھوٹے سرخ و مسٹرڈ پھولوں والی سیاہ جاپانی شیفون کی ساڑھی برآمد ہوئی۔ بغیر آستین کا بلاوز بھی ساتھ تھا۔

''میرے پاس کتنی ساڑھیاں ہیں؟ لگتا ہے آپکو ہوکا ہے۔''

''میں دنیا کی ہر خوبصورت چیز تمہارے لئے خریدنا چاہتا ہوں۔''

کمرے میں تھوڑی دیر خاموشی رہی۔صرف برتنوں کوٹرالی میں رکھنے کا ہلکا سا شور ہوا اور وہ بھی ختم ہوگیا۔

اور پھر اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''چلو اب تیاری کرو۔''

جب دفعتاً وہ اُس کے مقابل آ کر کھڑی ہوگئی۔اُس نے ملتجی انداز میں اُسے دیکھا اور بولی۔

''ایک بات کہوں، مانیں گے آپ۔''

اُس نے بے حد حیرت سے اُسے دیکھا۔یہ پہلا موقعہ تھا کہ اُس نے کوئی بات منوانے کے لئے فرمائش کی تھی۔

''کیا بات ہے۔نجمی؟''

یہ کہنے کے ساتھ ہی وہ دوبارہ بیٹھ گیا تھا۔اُسکے دل میں اُتھل پتھل ہونے لگی تھی۔یہ کیا کہنا چاہتی ہے؟

''میرے بالوں کی سیٹنگ طاہرہ جیسی کروا دیجئے۔اُن کے ساڑھی باندھنے چلنے پھرنے اور بچوں کے ساتھ پیار کے مخصوص انداز جو آپ کو یاد ہوں مجھے سکھا دیجئے۔بچے آرہے ہیں۔گھر میں ایک اجنبی عورت کو دیکھ کر انہیں اپنی ماں یاد آئے گی۔میں چاہتی ہوں میرے اندر انہیں اپنی ماں کا پرتو نظر آئے۔''

اُس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔شدت احساس سے اُس کی آنکھوں میں نمی سی اُتر آئی۔وہ اُسے دیکھتا رہا۔پھر اُس نے اُسے کلائی سے تھام کر اپنے پاس بیڈ پر بٹھایا۔اس کے نرم و نازک سے وجود کو اپنے حصار میں لیا۔اس کے بالوں پر اپنے ہونٹ رکھے۔اُس سے اُسے یوں محسوس ہوا تھا۔جیسے معبدوں میں رکھی کسی مقدس دیوی کے حضور

اُس نے نذرانہ عقیدت پیش کیا ہو۔

''تمجی تم اتنی گہری ہو میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔تمہارے سینے میں عورت کا نہیں فرشتے کا دل ہے۔زندگی میں شاید اور تو کوئی کارنامہ میں نے سرانجام نہیں دیا۔پر تمہیں چُن کر یقیناً میں نے بہت بڑا تیر مارا ہے۔''

وہ خاموش ہوگیا۔بہت دیر کمرے میں خاموشی رہی پھر اس خاموشی کو اس کی جذبات سے بوجھل آواز نے توڑا۔

اُس نے دائیں ہاتھ سے اُس کے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اگر یہاں خلوص اور محبت کی سچائی ہے تو پھر گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔''

وہ اگلی صبح راجشاہی چلا گیا۔اس نے ملحقہ کمرہ دونوں بچوں کے لئے سیٹ کروایا۔ڈرائنگ روم سے طاہرہ کا پوٹریٹ اٹھا کر بکس میں بند کروایا۔بچوں کو دو بجے آنا تھا۔وہ خود اکیلی انہیں لینے کملاپور اسٹیشن گئی۔چھوٹی چھوٹی پٹریوں پر چھوٹے ڈبوں والی گاڑیاں کھڑی تھیں۔وہ پلیٹ فارم نمبر تین پر آئی۔

دو بجے۔پھر تین کا وقت ہوا۔اس کے بعد ساڑھے تین ہوئے پلیٹ فارم پر کھڑی کھڑی اُسے یوں محسوس ہونے لگا تھا۔جیسے کسی نے اُسے دُھوپ میں سُوکھنے کے لیے ڈال دیا ہو۔

تبھی گاڑی کی آمد کا شور ہوا۔جونہی گاڑی نے اسٹیشن کی حدود میں قدم رکھا۔اُس کا دل دھک دھک کر اُٹھا۔سوتیلے بچے سوتیلی مائیں۔دُکھی کہانیاں ظلم وستم کے نرالے اور انوکھے واقعات اس کے دماغ میں گھومنے لگے۔

''میں راستے سے بھٹک چکی ہوں۔معبود ایک چھوٹی سی التجا ہے مجھے اور گمراہ نہ کرنا۔بن ماں کے بچے مجھ سے وہی سکون اور محبت پا سکیں جو انہیں ایک حقیقی ماں سے مل سکتا

تھا۔''

اس نے دُور تک نظریں دوڑائیں۔گاڑی دھیمی ہوتی ہوتی اب رُک گئی تھی۔بہت پیچھے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے دو بچے اُسے دکھائی دیئے۔وہ بھاگی اور پھر تیزی سے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوگئی۔وہ اُنہیں پہچان گئی تھی۔درجنوں تصویریں دیکھ چکی تھی۔

بچے کیسے پژمردہ اور بُجھے بُجھے سے تھے۔رنگ بھی پیلے پھٹک ہورہے تھے۔لڑکا بہت کمزور تھا۔یہی کوئی پانچ چھ سال کا ہوگا۔لڑکی چار سال کی نظر آتی تھی۔بچے نہ ماں پر تھے۔نہ باپ پر۔نقش موٹے موٹے اور رنگت گندمی تھی۔اُس نے پاس جا کر کہا۔

خوقان۔خوقی بچوں نے تھوڑی سی حیرت اور تعجب سے اُسے دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔اُس نے دونوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر اُن کی پیشانیوں پر پیار کیا۔تبھی اسے اپنے عقب سے گارڈ کی آواز سنائی دی۔اُس نے پلٹ کر دیکھا وہ کہتا تھا۔

''آپ بچوں کی گارجین ہیں۔یہاں سائن کر دیجئے۔''

اُس نے دستخط کیے۔بچوں کا سامان اٹھایا اور انہیں گاڑی میں بٹھا کر گھر لے آئی۔

شام تک بچے ذرا گھُٹے گھُٹے رہے۔پر رات کو کھانا کھلا کر جب وہ انہیں لے کر اپنے بیڈ پر لیٹی اور پریوں کی کہانی سنانے لگی۔تب لڑکے نے بے اختیار اُسے اپنی ننھی مُنی بانہوں میں جکڑ لیا۔اور لڑکی نے اس کے سینے میں اپنا مُنہ چھپا لیا۔اُس نے بھی باری باری اُن کے رخساروں اور آنکھوں پر پیار بھرے بوسوں کی بارش کر دی۔

اور تیسرے دن جب شب کو گیارہ بجے رحمان راج شاہی سے آیا اور بچوں کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ دونوں بچوں کے درمیان گٹھڑی سی بنی بے خبر سو رہی تھی۔بچی کی دونوں ٹانگیں اس کے کولہوں پر تھیں اور لڑکے کے دونوں بازو اُس کے گلے میں حمائل تھے۔

وہ مُسکرایا۔اِس مسکراہٹ میں کتنی آسودگی اور طمانیت تھی یہ صرف اس کا دل جانتا تھا۔جھک کر اُس نے بیٹے اور بیٹی کے گالوں پر پیار کیا۔انہیں ٹھیک طرح لٹایا اور پھر بے حد آہستگی سے اُس نے اُسے یوں اٹھایا جیسے وہ کوئی کانچ کی نازک سی چیز ہو۔اپنے بازوؤں میں بھر کر وہ جب سیدھا ہوا اُس کی آنکھ کھل گئی۔نیند سے لبریز آنکھیں۔وہ کسمسائی پر اس کی مضبوط گرفت میں کہیں چھٹنے کا امکان تھا۔

وہ ٹی وی لاؤنج سے ہوتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔درمیانی دروازہ بند تھا۔وہ مسلسل اس کے حلقے کو توڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

گھٹی ہوئی آواز میں جب اُس نے کہا تھا۔

خدا کے لیے چھوڑیئے تو ذرا۔میرا دم گُھٹا جا رہا ہے۔

''ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔''

بیڈ پر نیم دراز ہو کر اُس کے اوپر جُھکتے ہوئے وہ بولا۔

ہاں تو بیگم صاحبہ اِن دنوں بہت مصروف رہیں۔مجھے فون بھی نہیں کیا۔

وہ اب پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔

''کمال ہے صاحب۔جب فون کیا یہی جواب ملا۔بیگم صاحبہ بچوں کو گھمانے پھرانے گئی ہیں۔''ارے تمہیں بچوں کا اتنا خیال تھا اور بچوں کے باپ کا۔''

''اچھا چھوڑیئے ان باتوں کو۔''

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی،کھانے پینے کا بتایئے۔

وہ خمار آلود آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مُسکرایا اور خوابگاہ کی روشنی مدھم کرتے ہوئے بولا۔

''یہ ابھی بتاتا ہوں۔''

ان دس بارہ دنوں میں رحمان حیران رہ گیا۔ بچے جس قدر اُس سے مانوس ہو چکے تھے۔اُس کے خیال کے مطابق اتنے وہ اپنی ماں سے بھی نہ تھے۔اُس کا دن ان کے ہنگاموں میں گزرتا۔کہیں اُن کے لیے کھانے پکوا رہی ہے۔کہیں کپڑے تبدیل کروا رہی ہے۔کہیں اُن کے ساتھ مل کر کھیل رہی ہے۔گھر میں ہر وقت دھما چوکڑی اور شور وغل کی ایک فضا چھائی ہوئی تھی۔

اس دن رحمان کپڑے بدلنے کے لیے ڈریسنگ روم میں گیا۔

''نجمی۔''اُس کی گونج دار آواز لابی میں سے ہوتی ہوئی عقبی لان میں پہنچی جہاں وہ اُن کے ساتھ کیرم بورڈ کھیل رہی تھی۔

وہ بھاگتی ہوئی آئی۔

''بچوں کی کتنی چھٹیاں باقی ہیں؟''

''چھ''

''کل انہیں واپس بھیجنے کا بندوبست کرو۔''

اُس نے گھبرا کر کہا۔

''کیوں۔''

اس کی پریشان اور گھبرائی ہوئی صورت دیکھ کر وہ ہنس پڑا۔اس کے بکھرے بالوں پر اپنے ہونٹ رکھتے ہوئے وہ خوابناک سی آواز میں بولا۔

''دراصل میں بچوں سے جلنے لگا ہوں۔لگتا ہے انہوں نے تمہیں مجھ سے چھین لیا ہے۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''آپ بھی عجیب ہیں۔''

عجیب کیوں؟ خود کو دیکھو ذرا۔اُس نے گھسیٹ کر اُسے شیشے کے سامنے کھڑا کر دیا۔

اپنی صورت اور حلیہ دیکھو ذرا معلوم ہوتا ہے ہفتہ بھر سے نہ منہ دھویا ہے اور نہ کنگھی کی ہے۔

وہ ٹھیک کہتا تھا۔

سچ تو یہ تھا کہ وہ اُن کی معصوم حرکتوں سے اتنی محظوظ ہوتی کہ اُس دکھ کو بھی بھول جاتی جو اُس کے سینے میں کسی زہریلے پھوڑے کی مانند پک رہا تھا۔اُن کے قہقہوں نے اُسے اُس کی کربناک سوچوں سے بہت حد تک نجات دے دی تھی۔

اور اُس نے ایک ادائے دلربائی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بچے تو اب کہیں نہیں جائیں گے۔یہیں ڈھاکہ میں ہی پڑھیں گے۔میں تو اُن کی احسان مند ہوں کہ انہوں نے میری ہر دم برستی آنکھوں سے آنسوؤں کو اپنے محبت بھرے وجود میں جذب کر لیا ہے۔اب ان کے بغیر اس گھر میں رہنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔''

باب نمبر ۲۷

بچوں نے اُس کا ناک میں دم کر دیا تھا۔جناح ایونیو کی دُکانوں سے ڈھیر سارے کھلونے خرید کر بھی وہ مطمئین نہیں ہوئے تھے۔اب وہ بیت المکرّم کی طرف جانا چاہتے تھے۔خوقان وہاں سے ماؤتھ آرگن خریدنا چاہتا تھا۔وہ کہتی تھی کہ بھئی جب تمہیں بجانا نہیں آتا تو لے کر کیا کرو گے؟

''ارے مما سیکھ جاؤں گا۔آپ لے تو دیں۔''

اور وہ اُس کی ساڑھی کے آنچل سے لپٹے اُسے بیت المکرّم کی دکانوں کی طرف گھسیٹ کر لے گئے۔ایک نہیں کئی دوکانوں سے انہوں نے اور بھی کئی چیزوں کی خریداری کی۔

سامنے ہی بیت المکرّم کی وہ تاریخی مسجد تھی جسے جانے وہ کب سے دیکھنا چاہتی تھی۔لیکن وقت ہی نہیں ملا تھا۔اُس نے دونوں بچوں کی انگلیاں پکڑیں اور مسجد میں آ گئی۔

سیڑھیوں پر ٹھہر کر اُس نے اُس کے جلال و جمال پر ایک گہری نظر ڈالی۔آنکھیں بند کیں اور خدا سے دعا گو ہوئی۔جب اُس نے آنکھیں کھولیں اور دعا کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھ چہرے پر پھیرے خوقان اس کی ٹانگوں سے چمٹ کر بولا۔

''مما بتایئے آپ نے خدا سے کیا مانگا ہے؟''

وہ جھکی۔اس نے باری باری دنوں کو پیار کیا۔داہنے ہاتھ کے حلقے سے انہیں اپنے بازوؤں میں سمیٹا۔اس وقت لوگوں کی آمد ورفت کافی تھی۔مغرب کی نماز کے بعد کچھ لوگ ابھی بھی سیڑھیوں سے اُتر رہے تھے۔کچھ مسجد کے اندر بھی جا رہے تھے۔

خوقان نے اپنا سوال پھر دہرایا تھا۔

اس نے اپنی نم آنکھوں کو بائیں ہاتھ کی پوروں سے صاف کیا اور اپنے آپ سے کہا۔

''کیا مانگا ہے؟ یہ اگر بتاؤں تو تم کیا سمجھ سکو گے؟ بس سکون قلب کی دعا ہی کر سکتی ہوں۔''

لیکن اُس نے لڑکے کو یہ ضرور بتایا تھا کہ اُس نے اللہ میاں سے کہا ہے کہ اُس کے خوقان اور خوقی کو بہت بڑا آدمی بنائے۔

گاڑی میں بیٹھ کر اُس نے دونوں بچوں کو اپنے ساتھ فرنٹ سیٹ پر ہی بٹھا لیا۔اِس وقت رش اتنا زیادہ تھا کہ گاڑی کو باہر نکالتے میں ہی بیس منٹ لگ گئے۔وہ گھر جلدی پہنچنا چاہتی تھی۔رحمان نے رات کے کھانے کے لیے بریانی کی فرمائش کی تھی۔اور وہ خانساماں کو بناتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی۔

لیکن بچوں نے راستے میں ہی بکھیڑا ڈال دیا تھا کہ وہ اُگلو میں آئس کریم کھائیں گے۔اُس نے بتیرا ٹالنے کی کوشش کی۔گھر پر بنانے کا لالچ دیا۔پر جب لڑکی نے اس کے بازو پر اپنا ننھا منا ہاتھ رکھ کر کہا۔

''مما۔مان جایئے نا۔کھلا دیجیے نا آئس کریم۔

اُس کا سٹیرنگ پر جما ہاتھ لرز گیا تھا۔اور گاڑی کا رُخ خود بخود دوسری سڑک پر مڑ گیا۔

اب اُگلو میں جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

وہ اِس وقت بنگا ئیل کی نفیس کڑھت کی چاکلیٹی ساڑھی پہنے تھی۔بغیر آستین کے چُست بلاوز میں سے جھانکتا اُس کا براق پیٹ اور شانے برقی روشنیوں میں کوندا سا بن کر دیکھنے والوں پر لپکے تھے۔گھنے بالوں کے درمیان اس کا خوبصورت چہرہ کسی ماورائی مخلوق کا

نظر آیا۔ڈائمنڈ کی چین اور رنگ پس نے اُس کی شان کو اور دوبالا کیا ہوا تھا۔

بیروں نے مرعوبیت کے شدید احساس تلے جُھک جُھک کر خوش آمدید کہی اور اندر آنے اور میز تک جانے کا راستہ دکھایا۔

خاصی گہما گہمی تھی۔ساز بڑے تیز بج رہے تھے۔بچوں نے بیٹھتے ہی خوشی سے میز بجایا۔ویٹر آیا۔اُس نے آئس کریم کا آرڈر دیا اور خود کیو بکس لگے ہاتھوں کو غور سے دیکھنے لگی۔اُگلو میں وہ کئی بار رحمان کے ساتھ آئی تھی۔

پھر انہوں نے آئس کریم کھائی۔بل ادا کیا۔بیرے کو ٹپ دی اور جب وہ کرسیوں سے اُٹھ رہے تھے۔بچی یکا یک چلائی۔

''ارے مما دیکھئے وہ پپا بیٹھے ہیں۔کمال ہے ہمیں نظر ہی نہیں آئے۔

بچی نے اُنگلی سے اشارہ کیا اور ساتھ ہی بھاگنے لگی۔لڑکا بھی پیچھے بھاگا۔اُس نے گھبرا کر رُخ پھیرا۔دُور کونے میں رحمان دو مردوں اور تین عورتوں کے ساتھ میز کے گرد بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ تیورا کر گر جائے گی۔مدت بعد اس طرح سامنا ہوا تھا۔سارا بدن نرم سی شاخ پر لہراتے کسی پتے کی طرح ڈولنے لگا تھا۔آنکھوں کے گرد اندھیر چھا گیا تھا۔بچے چلّا رہے تھے۔''مما''

''مما آجایئے نا آپ''

کیسی نازک صورت حال تھی یوں جیسے پاؤں کے تلووں کے نیچے پُل صراط ہو۔لیکن اُس نے فی الفور خود پر قابو پایا۔اور اپنے آپ سے کہا تھا وہ کسی طور بھی رحمان کے لیے خفت یا سُبکی کا باعث نہیں بنے گی۔

آہستہ آہستہ پُر وقار قدموں سے وہ اُن کی طرف بڑھنے لگی۔رحمان اور دوسرے

دونوں مردوں نے نیم ایستادہ ہو کر اُسے تعظیم دی اور خالی کُرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک اچٹتی سی نظر اُس نے اُن عورتوں پر بھی ڈالی جو ان مردوں کے ساتھ تھیں۔ ایک ذرا عمر رسیدہ اور غیر ملکی تھی۔ دوسری دونوں جوان اور شکل وصورت سے بنگالی جان پڑتی تھیں۔ ایک کے بال کٹے ہوئے تھے۔ ایک کا جوڑا اور دوسری کی چوٹی کمر پر بل کھا رہی تھی۔ چہرے سادہ اور ساڑھیاں سوتی تھیں۔

انہوں نے بڑی تنقیدی نظروں سے اس کا جائزہ لیا تھا۔

ایک مرد نے کہا۔

''ہمیں افسوس ہے ہم آپ کو دیکھ نہیں سکے۔ بتائیے کیا کھانا پسند کریں گی؟ دوسرا پہلے والے کی معذرت پر زیر لب مُسکرایا تھا۔ کیونکہ واقعہ یہ تھا کہ اُس کے اندر آنے پر ہال میں موجود سبھوں کی نظریں اُس پر اٹھی تھیں۔ اُس نے تو کہا بھی تھا۔

''بھئی کیا غضب کی لڑکی ہے؟ ہیلن آف ٹرائے جیسی۔ اندر کیا آئی ہے سارا ماحول جگمگا گیا ہے۔ دوسرا ساتھی جانتا تھا۔ رحمان کو خاموش دیکھ کر اُسکی رگ شرارت پھڑکی تو ضرور۔ پر پھر جانے کیا سوچ کر چُپ رہا۔

اب وہ مصُر کہ وہ بیٹھے باتیں کرے اور اُنہیں بتائے کہ وہ کیا کھانا پسند کرے گی؟

چند لمحوں کے توقف کے بعد اُس نے کہا۔

اجازت دیجیے۔

''ارے بھئی کیا جلدی ہے بیٹھیے نا رحمان صاحب بھی تو یہیں ہیں۔

اُن کی اشتیاق سے لبریز نگاہیں وہ اپنے چہرے پر محسوس کرتی تھی اور سُرخ ہوئی جاتی تھی۔

اُس نے شائستگی سے معذرت کی اور بڑے رکھ رکھاؤ والے لہجے میں بات کرتے

ہوئے اُس نے کہا کہ وہ ضرور بیٹھتی اور اُنکی کمپنی سے لُطف اٹھاتی پر بچے آئس کریم کھانے کے لئے بضد تھے اور وہ ہم کھا چکے ہیں ۔نیز اُسے گھر جلدی جانا ہے کہ بچوں کو قرآن پاک پڑھانے کیلئے قاری صاحب آنے والے ہیں اور آج اُنکا پہلا دن ہے اور وہ نہیں چاہتی کہ وہ پڑھائے بغیر چلے جائیں ۔

اس بات پر رحمان نے بھی چونک کر اُسے دیکھا تھا۔ یہ انتظام اُس نے شاید انہی دنوں کیا تھا۔

اُس نے دونوں بچوں کے ہاتھ پکڑے اور خدا حافظ کہتے ہوئے ۔

مڑی اور نپے تلے قدموں سے چلتی باہر آ گئی ۔

اِس تمام وقت میں اُس نے ایک بار بھی رحمان کی طرف نہیں دیکھا اور نہ ہی اُس سے کوئی بات کی ۔یوں محسوس ہوتا تھا جیسے رحمان اِس صورت حال سے خاصا محظوظ ہو رہا ہو ۔البتہ وہ اپنی جرأت اور گفتگو پر خود حیران تھی ۔

جب وہ باہر آ گئی اور گاڑی میں بیٹھ گئی ۔اُس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا۔خنک ہواؤں کے جھونکوں کے ساتھ برقی روشنیاں اُس کا مُنہ چڑا رہی تھی ۔

اور اس کے جانے کے بعد اُن تینوں عورتوں اور مرد نے رحمان کو تعجب سے دیکھا اور کہا۔

''تم تو چھپے رستم نکلے ۔لعل کو کوٹھری میں چھپائے بیٹھے ہو۔''

''بقول تمہارے لعل ہے تو بھئی لعل تو چھپائے ہی جاتے ہیں ۔سامنے یا سرِعام رکھنے سے چوری ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے ۔''

بڑا زبردست قہقہہ پڑا تھا۔

''آپ کی بیوی بڑی کمسن اور بہت حسین ہے ۔بنگالی نہیں لگتی۔معمر خاتون بولی

تھیں۔''

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔مسکراتا رہا۔

''آپ کی مسز کا موڈ آف لگتا تھا۔سوچ سمجھ کر گھر جائیں۔''

نوجوان لڑکی نے رحمان سے کہا۔

''ارے نہیں۔بڑی پیاری ہے۔دیویوں جیسی عادات ہیں۔''

جب وہ گھر آئی۔وہی ہوا تھا جس کا خدشہ تھا۔قاری صاحب آئے تھے اور انہیں گھر نہ پا کر چلے گئے۔مسز حیدر کی تاکید تھی خیال رکھنا خود وقت کی پابندی کرنے والے انسان ہیں اور دوسروں سے بھی ایسا ہی چاہتے ہیں۔عام مولویوں کے برعکس بہت سُتھری عادات کے مالک ہیں۔

''چلو کل منت سماجت کروں گی۔''

اُس نے بچوں کو لاؤنج میں کھیلنے کے لیے چھوڑا اور خود کچن میں آ گئی۔بچوں نے بتیرا کہا کہ وہ اُن کے ساتھ کھیلے۔لیکن وہ اُن کے لئے اچھی سی بریانی پکوانے کا کہتی ہوئی باہر آ گئی۔سارا راستہ ذہن سُلگتا رہا تھا۔

تین عورتیں اور تین مرد۔

اور عین ان لمحوں میں ایک آواز اس کے خیالوں میں گونجی۔

''گھرداری کے چکروں میں پڑو گی تو پتہ چلے گا کہ یہ کیسے دکھ ہیں؟''

واقعی طاہرہ ٹھیک کہتی تھی۔گھرداری کے چکروں میں پڑے بغیر یہ دکھ کب سمجھ آتے ہیں؟میرے تن بدن میں کیسی آگ لگی ہوئی ہے؟

اُس کی بہت سی دوست لڑکیاں ہیں جن کے ساتھ اکثر اُس کی شامیں گذرتی ہیں۔خوبصورت اور اچھے چہروں والی لڑکیوں کو اُسے دیکھنے کی لت بھی ہے۔ان باتوں کا

اعتراف وہ خود کرتا ہے۔

خانساماں باورچی خانے میں نہیں تھا۔شاید کہیں باہر گیا ہوا تھا۔وہ دروازے کے پاس کھڑی تھی۔پتہ نہیں اُسے کیا ہوا؟

تیورا کر گری۔دروازے کے ایک پٹ پر البتہ ہاتھوں کی گرفت نے بہت زیادہ چوٹ لگنے سے بچالیا۔وگرنہ سر اور پیشانی لہولہان ہونے کا اندیشہ تھا۔

نوکر جب باہر سے آیا اور اُس نے دیکھا تو حیران ہوا۔اُلٹے پاؤں واپس بھاگا۔اس وقت رحمان بھی گاڑی پورچ میں کھڑی کر چکا تھا۔نوکر کو یوں ہراساں دیکھ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کیابات ہے۔اتنے بدحواس کیوں ہو رہے ہو۔''

اوراُس نے جو کچھ بتایا۔اُس نے رحمان کے ہاتھ پاؤں پھُلا دیئے۔بھاگا بھاگا آیا۔اُسے ہاتھوں میں اٹھا کر کمرے میں لایا۔ڈاکٹر کو فون کیا۔ڈاکٹر کے آنے تک بچوں کو بھی پتہ چل گیا۔انہیں شاید رحیم نے بتایا تھا۔دونوں بچوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔اور وہ بار بار اُس سے لپٹے جاتے تھے۔

ڈاکٹر نے انجکشن دیئے۔کچھ دیر بعد اُس نے آنکھیں کھولیں۔ڈاکٹر اس پر جُھکا ہوا تھا اور رحمان پاس کھڑا تھا۔بچے کُھلے دروازے سے پریشان نظروں سے دیکھتے تھے۔اُس کی کھلی آنکھیں دیکھ کر لڑکے سے ضبط نہ ہو سکا۔بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح بھاگا اور اس کے سینے پر گرا اور بولا۔

''مما آپ کو کیا ہوا ہے؟ ہم تو اچھے بھلے باہر سے آئے تھے۔

اور بچے کو اپنی بانہوں میں سمیٹتے ہوئے وہ رونے لگی تھی۔ڈاکٹر نے چند دوائیاں لکھیں۔کچھ احتیاطیں بتائیں اور رحمان سے رُخصت چاہتے اور اُسے سب ٹھیک ہے۔کہتے

ہوئے باہر نکل گیا۔

رحمان دیر بعد کمرے میں آیا۔دونوں بچے اس کے دائیں بائیں لیٹے تھے۔خوقان خوقی چلو بیٹے کھانا لگ گیا ہے کھاؤ۔

دونوں ماں کے بغیر کھانے سے انکاری تھے۔سُمجھا بُجھا کر اُس نے انہیں باہر بھیجا اور رحیم سے کہا کہ وہ کھانے کے بعد انہیں مسز حیدر کے ہاں لے جائے۔

بچے اور نوکر سے جب کمرہ خالی ہوگیا۔وہ اس کے قریب آیا۔اُس کے سرہانے کرُسی پر بیٹھا۔چند لمحوں تک ایک ٹک اُسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

اس موضوع پر آج جو باتیں ہوں گی دوبارہ ان پر بحث نہیں ہونی چاہیے میں تمہیں یہ کہنا چاہوں گا کہ جب تک تم حقائق سے آگاہ نہ ہو جاؤ۔اُس وقت تک فضول شک وشبہات کو دل میں جگہ نہ دو۔ایک دوسرے پر اعتماد اور یقین ازدواجی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔

دیکھو نجمی ایک کلیدی آسامی پر متمکن ہونے اور ساتھ میں اپنا بزنس کرنے کی وجہ سے میرا دائرہ تعلقات بہت وسیع ہے۔اس دائرے میں مردوزن دونوں ہی شامل ہیں۔احمق لڑکی تم سے مجھے کتنا پیار ہے۔یہ اگر بتاؤں تو تمہیں کبھی یقین ہی نہیں آئے گا۔یہ بھی کہوں گا کہ اس پیار کو حاصل کرنے میں تمہاری اچھی عادات کو بہت دخل ہے۔مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ تم میری کمزوری بن چکی ہو۔

پھر بصد اصرار اُسے کھانا کھلایا گیا۔مسز حیدر کے ہاں سے نوکر بچوں کو لیکر آیا۔دونوں بچے اس کے ساتھ لیٹے اور سوئے۔اِن کے سونے کے بعد رحمان نے انہیں اُن کی خوابگاہ میں پہنچایا۔

اس ساری رات رحمان نے اُسے کسی چھوٹے دودھ پیتے بچے کی طرح اپنے سینے

سے چمٹائے رکھا۔

باب نمبر ۲۸

ایک ڈرپوک دبّو اور سہمے سہمے چہرے والی بیوی کی خواہش کبھی کبھار اُس کے سینے میں اُس وقت مچلتی تھی جب طاہرہ زندہ تھی اور کلب میں برج کھیلتے ۔ پینے پلانے یا اپنی کسی گرل فرینڈ کے ساتھ کسی ہوٹل میں خوش گپیوں میں آدھی رات ہو جاتی۔ وہ جب گھر لوٹتا تو اتنا پرلُطف وقت گذارنے کا نشہ ہرن ہو جاتا۔ طاہرہ خوابگاہ میں کرسی پر کسی کتاب کے مطالعے میں، بننگ یا بچوں کے کسی کپڑے کی سلائی میں مصروف ہوتی وہ جب کمرے میں داخل ہوتا وہ تیکھی نظروں سے اُسے دیکھتی اور یہ نظر اُسے کیا کیا نہ کہہ جاتی۔

پھر پل جھپکتے میں وہ اُٹھتی اور ساتھ والے کمرے میں غائب ہو جاتی۔ کٹ کھڑاک دروازے بند ہوتے اور کھلتے۔ بچے گہری نیند میں ڈوبے اس ہنگامے سے جاگ جاتے۔ پورا گھر شور سے یوں گونجتا جیسے گھر پر کوئی ایر ریڈ ہو گیا ہو۔ اب وہ لاکھ چاہتا کہ کسی طرح اُس کا بگڑا موڈ درست ہو جائے پر توبہ جس کمرے میں وہ اپنے آپ کو جبری بند کرتی۔ وہ چاہے پھر ''طاہرہ طاہرہ'' دروازہ تو کھولو۔ میری بات تو سنو۔ کہتا کہتا صبح بھی کر دیتا نہ اُس پتھر کو جونک لگتی اور نہ دروازہ کھلتا۔

علی الصبح وہ برتنوں کو زور زور سے بجاتی۔ جوتے گھسیٹ گھسیٹ کر خوامخواہ شور پیدا کرتی۔ نوکروں کو اُونچے اُونچے ڈانٹ ڈپٹ کرتی۔ بچوں پر بلاوجہ ناراض ہوتی اور یہ سب وہ اُسے تنگ کرنے، جلانے اور ستانے کو کرتی۔ وہ برتنوں کے شور سے بڑا الرجک تھا۔ اُسے گھر میں سکون اچھا لگتا تھا۔ عورت کا گلا پھاڑ کر چیخنا چلانا اور اُونچے اُونچے بولنا اُسے ناپسند تھا۔ اِن دنوں گھر میں ٹینشن کی ایک فضا قائم کرنا اُس کا محبوب مشغلہ بن جاتا۔

اور پھر اُسے منانے کے لیے اُسے ایک طرح ناک ہی رگڑنی پڑتی۔

یوں طاہرہ بہرحال ایک محبت کرنے والی بیوی تھی ۔اُس میں اکڑ تھی ۔دبدبہ تھا ۔تنتنا تھا۔اور یہی چیزیں جب حد سے بڑھ جاتیں تب ان میں زور دار جنگ ہوتی ۔طعنوں وتشنیع کے کوڑے ایک دوسرے کو زخمی کرتے ۔

اور پھر وہ ہفتوں کے لئے ایک دوسرے سے دُور ہو جاتے ۔

لیکن اب تو جیون کا پانسہ ہی پلٹ گیا تھا ۔ایک کمزور دبّو اور سہمے سہمے چہرے والی بے حد خوبصورت لڑکی اُس کی ہر بات پر اپنا سر جھکاتی تھی اس کی شریک زندگی تھی ۔جس کی محبت چاہت اور خدمت کے انداز طاہرہ سے بہت مختلف تھے ۔

بچوں کے آنے سے وہ بہت مُصروف ہو گئی تھی ۔اس لیے اب رحمان بھی دیر سے آنے لگا تھا ۔لیکن تھوڑے دنوں بعد اُسے احساس ہوا کہ وہ سوتی نہیں ہے ۔بلکہ سونے کا بہانہ کرتی ہے ۔

یہ شک اُسے یوں ہوا تھا ۔کہ وہ رات کو جس طرح گر پڑ کر سو جاتا صبح قرینے سے لیٹا ہوتا ۔چادر سے ڈھپا ہونے کے ساتھ ساتھ پاؤں سے جرابیں اُتری ہوئی ہوتیں ۔ٹانگیں سیدھی اور سر کے نیچے دو تکیے ہوتے ۔وہ ہمیشہ سے دو تکیئے رکھنے کا عادی تھا ۔

صبح ناشتے پر وہ اُسے دیکھتا ۔اس کی آنکھوں کے پپوٹے بھاری بھاری سے لگتے ۔چہرہ تکان زدہ ہوتا ۔

ایک صبح وہ بے اختیار پوچھ بیٹھا ۔

''تمہیں کیا بات ہے ۔رات ٹھیک سے سوئی تھیں ۔''

اُس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں ۔اُسے دیکھا اور نرم سی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کر بولی ۔

''جی ہاں ۔میں نے تو پوری نیند لی ہے ۔''

اور وہ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوتے صرف اتنا بولا۔

''لگتا نہیں۔''

اُس نے پلکیں اٹھا کر پل بھر کے لیے اُس کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر فوراً انہیں جھکالیں۔

وہ خاموش رہا۔ رفتر کے لئے تیاری کے دوران بھی اُس نے خاموشی اپنائے رکھی اور جب وہ اسے بریف کیس تھما رہی تھی اُس نے پریشانی سے پوچھا تھا۔

''آپ اتنے چُپ کیوں ہیں؟''

''نجمی بھلا تم اس کی وجہ نہیں جانتیں۔''

وہ گاڑی میں بیٹھا اور چلا گیا۔ اس رات وہ پھر دیر سے آیا۔ بستر پر خاموشی سے لیٹنے کی بجائے وہ اس کی طرف آیا۔ وہ کروٹ بدلے بظاہر گہری نیند سوتی جان پڑتی تھی۔ جھک کر اُس نے اُس کے ریشمیں بالوں پر ہاتھ پھیرا جو تکیے پر بکھرے پڑے تھے اور پھر پیار بھری آواز میں بولا۔

''نجمی''

بند آنکھیں کھلیں اور اُس نے دیکھا کہ اُن میں نیند کا شائبہ بھی نہ تھا۔

"چودھویں کے باز۔ میرے ساتھ ہیرا پھیری کرتی ہو۔"

اس نے اُسے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

''تمہاری یہ خاموشی مجھے مار ڈالے گی۔ یہ بیگانگی اور اجنبیت کیسی ہے؟ میں آجکل دیر سے گھر آرہا ہوں۔ تمہیں اس دیر کی وجہ نہیں پوچھنی چاہیئے۔ تمہیں تو مجھ سے لڑنا چاہیئے۔ جھگڑنا چاہیئے۔ میرے دامن کو تھام کر جواب طلبی کرنی چاہیئے یہ جمود جو تم نے اپنے اوپر طاری کر رکھا ہے۔ میرا اس سے دم گھٹتا ہے۔''

''نجمی''اُس نے اس کی پیشانی پر پیار کیا۔

بند پلکوں پر آنسو موتیوں کی طرح چمکنے لگے تھے۔

وہ بے چین ہو گیا۔

تمہاری یہ بے بسی تمہاری آنکھوں پر مچلتے یہ آنسو مجھے پاگل کردیں گے میں تمہاری پریشانیوں سے آگاہ ہوں۔انہیں سمجھتا ہوں۔تمہارے دُکھوں سے واقف ہوں۔نجمی تم کیا سمجھتی ہو میں تمہارے لئے کچھ نہیں کررہا ہوں۔دیکھو جو کچھ ہو چکا ہے اُس پر افسوس اور پچھتاوا بیکار ہے۔ہم ذہنی رفاقت کی اُس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں ایک دوسرے سے الگ ہونا موت تھی۔تمہاری مسکراہٹ اب میری زندگی ہے۔

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

اپنے سینے پر اس کا سر رکھے اور اس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے وہ بول رہا تھا۔اپنے آپ سے جیسے باتیں کرتا ہو۔

انسان بھی کیا ہے۔وقت کے ساتھ ساتھ کیسے اُس کی خواہش بدلتی رہتی ہیں کبھی وقت تھا کہ جب طاہرہ مجھ سے جھگڑا کرتی،الجھتی تب میں چاہتا میری بیوی بڑی دبّو قسم کی ہو۔پر اب تمہاری یہ خاموشی مجھے بے چین کر دیتی ہے۔

میں چاہتا ہوں تم میری جواب طلبی کرو۔مجھ سے لڑو۔مجھ سے ناراضگی کا اظہار کرو۔

باب نمبر۲۹:

میں یہ شادی ضرور اٹینڈ کروں گی۔

اُس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

آرام کرسی میں دھنسے رحمان نے اُسے مسکرا کر دیکھا اور کہا۔

اگر میں اجازت نہ دوں تو.........

اُس نے ننگ مشین روک کر بڑی شوخی سے رحمان کو دیکھا اور بولی۔

"تو معلوم ہے میں کیا کروں گی؟"

''بولو۔وہ مسکرا رہا تھا۔اُسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔اور اِس صورت سے لُطف اٹھا رہا تھا۔اور نیڈل میں دھاگہ ٹھیک کرتے ہوئے اُس نے کہا تھا۔

''تو میں نہیں جاؤں گی۔''

اُس نے قہقہہ لگایا۔اپنی جگہ سے اٹھا۔اس کے قریب بیٹھا اور پیار سے اس کے بال کھینچ کر بولا۔

''تو پھر طے ہے،ہم چلیں گے۔''

واقعہ یہ تھا۔

رحمان کی بھتیجی کی شادی تھی۔دعوتی کارڈ تو خاصے دن ہوئے آ گیا تھا۔

اُس نے جب یہ رحمان کو دکھایا اور جانے کے متعلق پوچھا تو وہ خاموش ہی رہا''دیکھیں گے۔'' کہتے ہوئے اس سلسلے میں اُس نے مزید کوئی بات ہی نہیں کی۔البتہ اس کا دل بڑا چاہتا تھا کہ وہ اولڈ ڈھاکہ جائے۔تنگ و تاریک سی گلیوں میں جہاں آسمان کی صورت بھی بمشکل نظر آتی ہے اُس گھر کو دیکھے جو بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔جس کے

کمرے بالکونیاں، شہہ نشینیاں ۔ سیڑھیاں بھی ایک خاص طرز تعمیر اور تہذیب کی نمائندہ اور بنگال کے قدیم تاریخی ورثے کی امین ہیں ۔ جہاں اُس کی چار پانچ بھاوجیں تین بہنیں اور ان کے ڈھیر سارے بچے ہیں ۔مگر رحمان اپنی فیملی سے بڑا الرجک نظر آتا تھا۔صرف ایک مرتبہ وہ اُسے لیکر اپنے قدیمی گھر میں گیا تھا۔جب وہ اُس کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تھی ۔رحمان چچا، رحمان ماموں، رحمان بھائی ،اپنی نئی دُلہن کے ساتھ آئے ہیں ۔

ایسی آوازوں سے گھر گونج گیا تھا۔

وہ ایک بڑے سے کمرے میں تخت پر بیٹھی ایک معمر خاتون جسے رحمان نے جہاں آرا آپا کہہ کر اُس کا تعارف کروایا تھا کے پاس بیٹھ گئی ۔انہوں نے شفقت بھرا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔محبت سے اپنے بازوؤں میں سمیٹا۔پیشانی پر بوسہ دیا اور بہت سی باتیں پُوچھیں ۔جن کے جواب وہ بڑی مدھم آواز میں دیتی رہی ۔

رحمان کی خواہش کے باوجود اُس نے بھاری کامدار ساڑھی نہیں پہنی تھی ۔ زیورات بھی الماری کے سیف سے نہیں نکالے تھے ۔ایسے کپڑوں اورزیورات سے لد پھند کر جانا ایک ایسے گھر میں جہاں بہرحال طاہرہ کی کسی نہ کسی حوالے سے رشتہ داری تھی ۔بُہت ناپسندیدہ تھا۔یوں بھی خوانخواہ ہی آدمی تکلف اور مصنوعی پن کا لبادہ اوڑھ لے ۔لیکن جب رحمان نے اصرار کیا۔سمجھنے کی کوشش کرو۔میری اُن رشتہ دار خواتین کا ذہنی اُفق اتنا بلند نہیں کہ وہ کپڑوں زیوروں سے بالا ہوکر بھی کچھ سوچیں ۔تمہیں ننگی بچھی دیکھ کر وہ یہی اندازے لگائیں گی کہ میں دیوالیہ ہوگیا ہوں ۔

وہ روہانسی سی اُس کے سینے پر سر مارتے ہوئے بولی ۔آپ سمجھتے کیوں نہیں؟

’’انکی سوچیں انکے ساتھ۔ ہمارا طرزِ عمل ہمارے ساتھ۔چنانچہ اُس نے وہی کیا جو چاہا۔رحمان ہنسا بھی ۔اب تم نے پر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے ہیں ۔

شیفون کی جوگیا رنگی ساڑھی اور ڈائمنڈ کے ٹاپس چین والے سیٹ کے ساتھ وہ اتنی زیادہ دلکش لگ رہی تھی۔ کہ بھاری بھاری جوڑوں اور نیلی پیلی ساڑھیوں والیوں نے بیک زبان سرگوشی کی تھی۔

"بہت خوبصورت اور کم عمر دلہن ہے۔"

پہلی بار اُسے دیکھا تھا۔ سبھوں نے رونمائی میں کچھ نہ کچھ دیا۔ بڑی جیٹھانی اور بڑی نند نے انگوٹھیاں دیں۔

رات کا کھانا انہوں نے سب کے ساتھ کھایا۔ اس سارے وقت وہ خاموشی سے سب کو دیکھتی اور سُنتی رہی۔ مگر خود کچھ زیادہ نہ بولی گو وہ اُس سے بنگلہ کی بجائے اُردو بول رہے تھے۔

پر جو کچھ پوچھا جا رہا تھا اُس میں اندخانے کہیں چنگاری تھی، کہیں بھڑکتی آگ سی تھی۔ خود کچھ بولنے کی بجائے وہ رحمان کی طرف دیکھتی۔ وہ خود ہی موزوں جواب دے دیتا۔ رحمان سے ایک نمبر بڑے بھائی کی بیوی نے طنز ملی شوخی سے کہا۔

''اے کیا گونگی سے بیاہ کرلیا ہے۔''

وہ سُرخ ہوگئی تھی۔

رحمان نے محظوظ ہوتے ہوئے ہنس کر کہا۔ ''اب جیسی بھی ہے تمہارے سامنے ہے۔ گونگی ہے یا اندھی کانی۔''

اور جب وہ واپس آرہے تھے اُس نے راستے میں اولڈ ڈھاکہ والوں کے بارے میں اُس کے تاثرات جاننے چاہے تھے۔

اُس نے جواباً کہا۔

مختصر سی ملاقات میں کیا رائے دی جا سکتی ہے۔ عمومی سا تاثر تو کچھ اچھا

نہیں ۔بُہت تیز طرار لگتی ہیں ۔لیکن صحیح اندازہ تو ساتھ رہ کر اور میل جول سے ہی ہو سکتا ہے ۔آپ کی دونوں بہنیں جہاں آرا آپا اور رولدو آپا مجھے بہت شفیق لگی ہیں ۔اُن کے لہجے اور انداز میں ممتا کی جھلک نظر آتی ہے ۔

"میں بُہت الرجک ہوں اپنی اِن بھاوجوں سے ۔یہ بی جمالو ٹائپ عورتیں ایک سے ایک بڑھ کر چغل خور، حاسدی اور اچھے بھلے گھروں میں آگ لگا کر تماشا دیکھنے والی ہیں ۔اُسکے لہجے میں نفرت کا کھلم کھلا اظہار تھا ۔

اِس کے بعد وہ پھر کبھی وہاں نہیں گئی ۔لیکن پیچ در پیچ گلیوں میں واقع وہ محل نما گھر جس کی غلام گردشیں پیل پائے اور شہہ نشینیں اپنے اندر پُر اسرار سے ماضی کو سنبھالے ہوئے تھیں اسے بے طرح بھایا تھا ۔

وہ چاہتی تھی کہ مہندی کی رات کو وہاں جائے اور بنگال میں شادی کی رُسوم دیکھے ۔مگر رحمان نے اس مسئلے پر کوئی بات ہی نہیں کی اور وہ بھی خاموش ہی رہی ۔

رحمان اچھی طرح جانتا تھا کہ ہر آنکھ اُس کا تنقیدی جائزہ لے گی ۔اُسے دیکھا نہیں گھورا جائے گا۔اس کی ہر بات اور ہر حرکت نوٹ ہوگی ۔یہی وجہ تھی کہ اُس نے اُس کے لئے انتہائی قیمتی لباس تیار کروایا۔جس صبح اُسے شادی میں جانا تھا وہ اُسے ڈھاکہ کے مشہور بیوٹی سیلون میں لے کر گیا اور دو گھنٹے کی محنت شاقہ کے بعد جب وہ باہر نکلی تو آسمانی مخلوق نظر آ رہی تھی ۔رحمان خوش دلی سے مسکرایا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ۔

جنت ارضی کی یہ حور آج سب چراغوں کو گُل کر دے گی ۔

اُس کے ہونٹوں پر رحمان کے ان تحسین بھرے جذبات سے بڑی شہد آگیں مسکراہٹ اُبھری تھی ۔اُس کی پلکیں بار حیا سے جُھک گئی تھیں ۔

واقعی ایسا ہی ہوا تھا جیسا رحمان نے ظاہر کیا تھا۔گلی سے گھر کے اندر تک جانے

میں عورتیں مرد لڑکے اور لڑکیاں اُسے دیکھ کر یوں رُک رُک جاتے تھے جیسے کوہ قاف کے پہاڑوں سے کوئی پری اُتر کر اِن گلیوں میں آ گئی ہو۔ اُسے جہاں آرا آپا کے پاس چھوڑتے ہوئے وہ بولا۔

آپا دھیان رکھیئے گا اس کا جلد گھبرا جاتی ہے۔

''ارے فکر نہ کرو۔''

اور انہوں نے بڑی محبت سے اُسے اپنے پاس بٹھایا۔ بچے بھی پاس ہی بیٹھ گئے تھے۔ رشتہ دار عورتوں نے رحم بھری نظروں سے بچوں کو دیکھا اور پیار کرنے کے لئے ہاتھ پکڑنا چاہا۔ پر بچوں نے کمال بے نیازی سے اُن کے ہاتھ جھٹک دیئے حتیٰ کہ جہاں آرا آپا کی بڑی بہو جو بچوں کی حقیقی خالہ تھی اُسے بھی بچوں نے لفٹ نہ کرائی۔ اُس نے اس بات کو محسوس کیا اور طنز بھرے لہجے میں بولی۔

''بچوں پر تو جادو ہو گیا لگتا ہے۔''

اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔ جہاں آرا آپا نے محسوس کیا۔ بات کی تلخی کم کرنے کے لئے بولیں۔

''بچہ اور کتا پیار کا۔ محبت کرتی ہوگی نا۔ تبھی بچے دیوانے ہیں۔ ایکا ایکی جیسے اس اپنے عقب سے سرگوشیوں کی آواز سنائی دی۔

''نصیبوں جلی سدا ہی میاں کے لچھنوں پر کڑھتی رہی۔ اسی سے دوستانہ تھا جبھی تو اُسے موت کی نیند سلا دیا۔''

جہاں آرا آپا سمدھیانے کے بلاوے پر اٹھ کر باہر گئی تھیں۔ تبھی ایک معمر عورت اُس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''اے بچی تم اتنی خوبصورت ہو۔ ایسی پیاری ہو کہ تمہیں دیکھ کر بندہ پروردگار کی

تعریف کرنے لگتا ہے۔بھلا کوئلوں کی اِس دلالی میں تم نے کاہے کو اپنا منہ کالا کرنا تھا۔کوئی نیک شریف ہوتا تو بات بھی تھی ایسا لُچا،لفنگا،شرابی کبابی۔بھلا کون ساعیب ہے جو اس میں نہیں ارے بیٹی تم نے کچھ تو سوچا ہوتا۔کسی گرے پڑے خاندان کی بھی نہیں دِکھتی ہو۔صورت شکل سے اُونچے حسب نسب کی معلوم ہوتی ہو۔

ایک اور عورت بھی پاس آ کر بیٹھ گئی۔

وہ بھی بولی۔

''قربان جاؤں بنانے والے کے کیا حسن دیا۔پر قسمت پھوٹ گئی اے طاہرہ بدنصیب نے تو کچھ بھی نہ دیکھا۔

اُس نے پاگلوں کی طرح انہیں دیکھا۔اُس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

''طاہرہ مری نہیں اُسے مارا گیا ہے۔''

یہ ایسا کربناک خیال تھا جس نے اُسے دہلا ڈالا تھا۔

باب نمبر ۳۰:

دونوں وقت ملتے تھے جب وہ برآمدے میں آئی اور کُرسی پر بیٹھی۔اِس وقت پروائی ہوائیں اُس کے لان میں اُگے کیلوں اور پپیتے کے پتوں پر دھیرے دھیرے بہہ رہی تھیں۔نیلا شفاف آسمان قدرے سیاہی مائل نظر آرہا تھا۔پرندوں کے غول قطاروں میں اُڑے چلے جارہے تھے۔اِس نے حسرت سے بھرپور نظر اُن پر ڈالی اور اپنے آپ سے بولی۔

''مجھ سے تو یہ پرندے ہی اچھے ہیں۔''

اُس کی آنکھیں بند ہوگئی تھی۔اُسے تو یہ سوچ سوچ کر حیرت ہوتی تھی کہ وہ اب تک زندہ کیسے ہے؟اس کا ہارٹ کیوں نہ فیل ہوگیا؟ ہنگاموں سے پُر اُس گھر میں رحمان سے متعلق اتنی رکیک خبر سُن کر اُسے بھلا یونہی رہنا چاہیئے تھا۔ایک عورت تو غلط بات کہہ سکتی ہے۔مگر دوعورتیں اتنابڑا جھوٹ کیسے بول سکتی ہیں؟ آخر ضمیر اتنا بھی مُردہ نہیں ہوتا۔

وہ بھاری بھرکم عورت تو اسے یہ مُژدہ جانفزا سنا کر اٹھ گئی پر اُس کا جی چاہا کہ چیخیں مارے۔بین ڈالے۔زور زور سے روئے۔اتنی اُونچی آواز میں گُرلائے کہ سارا گھر اکٹھا ہوجائے۔سب حیرت واستعجاب سے پوچھیں کہ کیا ہوا ہے؟وہ کیوں اتنی ہلکان ہورہی ہے؟کس لیے اتنا بلیا پاپ کررہی ہے؟ تب وہ انہیں بتائے کہ دیکھو یہ عورتیں مجھے کیا بتارہی ہیں۔کہیں رحمان ایسا بھی ہوسکتا ہے؟

کھانا شروع ہورہا تھا۔کمرے میں بیٹھی عورتیں اٹھ اٹھ کر جانے لگیں جب جہاں آرا آپا اندر آ ہیں اورانہوں نے شفقت بھرے لہجے میں اُس سے کہا۔

اٹھو۔جاؤ بیٹی تم کھانا کھا آؤ۔بھوک لگ رہی ہوگی۔

اُس نے سفید ساڑھی اور سفید بالوں والی اس مہربان سی عورت کو دیکھا تب اس کا دل بے اختیار چاہا کہ اُن کے سینے سے لگ جائے اور دل کا سارا درد آنکھوں سے بہا دے۔اُن سے کہے۔

''جہاں آرا آپا میرا تو یہاں کوئی نہیں۔میں تو اس سرزمین پر اجنبی اور غیر ہوں۔اگر رحمان ایسا ہی ہےتو یہ اس کے ساتھ کتنا بڑا دھوکا ہے؟ کتنا بڑا فراڈ ہے؟

اُسے یہ بھی خیال آرہا تھا کہ رحمان اپنے رشتہ داروں سے بڑا الرجک ہے۔بڑا بدظن ہے۔اس کے خاندان کی عورتیں اول نمبر کی سازشی اور حاسد ہیں۔پر وہ عورتیں اس کی بھاوجیں نہیں تھیں۔بہنیں بھی نہ تھیں۔یوں بھی ایک آدھ عورت غلط بیانی کر سکتی ہے۔اکٹھی تین عورتیں۔خود رحمان کی بھی بعض باتیں مشکوک لگتی ہیں۔

ذہن سوچوں کے بھنور میں اُلجھا ہوا تھا۔جہاں آرا آپا اُسے پیار بھرے لہجے میں کھانا کھانے پر اصرار کر رہی تھیں۔بچے بھی اِدھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔اس کے پاس آگئے اور "مما بھوک لگی ہے چلیئے نا کھانا کھانے" کا ورد کر رہے تھے۔وہ اٹھی اور پنڈال پہنچی۔اس نے بچوں کو کھلایا۔پر جب اُس نے چمچ اپنے منہ میں ڈالنا چاہا۔اسے احساس ہوا اگر اس نے یہ چاول کھا لیے تو اُس کی انتڑیاں تک باہر آجائیں گی۔

ٹھنڈے پانی کا گلاس پیا۔پھر وہ ان کے ساتھ واپس اپنی جگہ آکر بیٹھ گئی۔

اِس گھر میں آنے اور یہ شادی اٹنڈ کرنے کی ساری خوشی خاک میں مل گئی تھی۔ہر آنکھ اُسے گھور رہی تھی۔ہر نظر کی وہ زد میں تھی۔رحمان کی دوسری بیوی سُن سُن کر اُس کے کان پھوڑا بن گئے تھے۔جن سے خون ملی پیپ رسنے لگی تھی۔وہ چاہتی تھی۔بھاگ جائے کہیں۔سلیمانی ٹوپی پہن لے۔ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔بیٹھنا عذاب بن گیا تھا۔

جب وہ رحمان کے بلاوے پر جانے کے لئے باہر آئی وہ گاڑی کے قریب کھڑا اس کا منتظر تھا۔اس کی چال میں اُس وقت وہ بانکپن نہیں تھا جو صبح محسوس ہوتا تھا۔شکستگی تھی ۔چہرہ نڈھال تھا۔صبح والی بشاشت اور تازگی کافور تھی ۔

رحمان اگر شادی کے ہنگاموں سے اتنا نہ تھک چکا ہوتا تو شاید اس پر ایک نظر پڑتے ہی بھانپ جاتا پر اُس نے گاڑی چلائی اور تیزی سے گھر آیا کیونکہ اُسی شام اُسے دس دن کے لئے کھٹیا ۔سراج گنج بوگرا اور رگائے بندا کے دورے پر جانا تھا۔اُس نے کپڑے بدلے ۔منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور کمرے میں آ کر اس کے ساتھ لے جانے کے لئے سامان پیک کرنے لگی ۔

نوکر نے سامان کار کی ڈکی میں رکھ دیا ۔رحمان ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اس پر الوداعی نظر ڈالی۔عجیب پتھرائی پتھرائی آنکھوں سے وہ اُسے دیکھ رہی تھی ۔رحمان گاڑی سٹارٹ کر چکا تھا۔رُک گیا گھبرا کر باہر نکلا اُس کے قریب آیا۔اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

تم پریشان نظر آ رہی ہو۔

اور اس نے گویا کلیجے پر پتھر رکھ لیا ۔پہاڑ جتنا حوصلہ کر لیا ۔بڑے ضبط کا ثبوت دیتے ہوئے بولی۔

نہیں تو شادی والے گھر کی تھکاوٹ کا اثر ہے ۔

''نجمی مجھ سے جھوٹ مت بولو''

''کمال ہے آپ یقین کیوں نہیں کرتے ۔''

اُسے بہت جلدی تھی ۔خدا حافظ کہا۔گاڑی میں بیٹھا اور گیٹ سے نکل گیا ۔

اور یہ دن کیسے گذر رہے تھے ۔سوچوں میں ،اُلجھنوں اور عجیب وغریب خیالوں

میں۔ایک بار اُس کا جی چاہا کہ وہ جہاں آرا آپا کے پاس جائے اور اُن سے دریافت کرے۔کبھی اس کا دل اس بات کی سچائی پر بالکل ایمان نہ لاتا ۔وہ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔وہ اپنے آپ سے کہتی ۔اس کا طرزِ عمل اول دن سے آخر تک اس کے سامنے آتا ۔وہ اس کی روشنی میں اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لیتی۔

''نہیں نہیں رحمان کبھی ایسا نہیں ہوسکتا۔وہ تو اعلیٰ اقدار کا حامل ایک بے حد پیارا انسان ہے۔''

تب اس کا بے قرار دل ٹھہر جاتا۔پر یہ کیفیت زیادہ دیر قائم نہ رہتی ۔شراب پینے فلیش کھیلنے اور لڑکیوں سے دوستی والی باتیں اگر درست ہوسکتی ہیں تو زہر دینے والی بات بھی غلط نہیں ہوسکتی۔چھوٹی سی کا بتنگڑ تو بن سکتا ہے۔رائی کا پہاڑ تو ہو جاتا ہے مگر بغیر بنیاد کے باتیں گردش نہیں کرتیں۔

وہ کہاں جائے؟ کس سے پُوچھے ؟ کیا کرے؟اس کا دل چاہتا بھاگ جائے ۔زمین کی پنہائیوں میں گُم ہو جائے۔آسمان کی وسعتوں میں کھو جائے مگر اس لئے کہیں گوشہ عافیت نہ تھا۔وہ تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہی تھی ۔رسوائیوں اور بدنامیوں کی کالک اُس نے اپنے چہرے پر آپ ہی مل لی تھی۔اور ان سب کے بدلے اس نے کیا حاصل کیا؟ یہ پریشانیاں یہ دل کو ڈستے دُکھ جن میں وہ گھر گئی تھی۔

اب اسے ایک نئے اندیشے نے گھیرے میں لے لیا تھا۔رحمان آخر کب تک اس کی اشک شوئی کرے گا۔ایک دن ایسا آئے گا وہ اُس کی بور رفاقت سے اکتا جائے گا۔اُسے پھر کسی شوخ وشنگ اور چلبلی لڑکی کی تلاش ہوگی جو یقیناً اُسے مل بھی جائے گی۔

یہ اندیشے ایسے خوفناک تھے۔یہ سوچیں ایسی خطرناک تھیں کہ جنہوں نے اُسے ذہنی طور پر بُری طرح مجروح کر دیا تھا۔

ایک دن جب بیڈ پر لیٹی ہوئی ایسی ہی اُلٹی پلٹی سوچوں میں گم تھی ۔خواب گاہ میں ہلکی نیلی روشنی بکھری ہوئی تھی ۔اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کمرے کی سب چیزیں اس کی طرف بڑھ رہی ہیں۔گھبرا کر اُس نے چیخ ماری اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا ۔اسے یوں لگا جیسے کوئی غیر مری طاقت اُس کا گلا گھونٹ رہی ہے۔دیر تک وہ دم سادھے لیٹی رہی ۔پھر بڑے حوصلے سے اُٹھی ۔لائٹ جلائی ۔کمرے میں ٹیوب کی دودھیا روشنی جگمگائی تو اُسے قدرے سکون ہوا۔

اب اُس کے لئے چت لیٹنا محال ہوگیا تھا۔جہاں سیدھی لیٹتی بس یوں لگتا جیسے ابھی کوئی گردن مروڑ دے گا۔عالم تصور میں بارہا وہ اُس کے ہاتھوں کو اپنی گردن کی طرف بڑھتے ہوئے بھی دیکھتی۔

اور دن رات کی ایسی کربناک سوچوں میں گھلنے کا نتیجہ ظاہر ہونا ہی تھا اور وہ یوں ہوا کہ رحمان جب دس دن بعد گھر واپس آیا تو عقبی برآمدے میں اُسے کرسی پر نیم دراز آنکھیں موندھے دیکھ کر اُسے جھٹکا سا لگا۔

یہ اسے کیا ہوگیا ہے۔میں تو اچھا بھلا چھوڑ کر گیا تھا۔لگتا ہے جیسے سالوں کی مریض ہو۔

وہ اس کے قریب آیا۔اس کی پیازی رنگت سرسوں کے پھولوں جیسی ہو رہی تھی ۔پہلی مرتبہ اُسے احساس ہوا کہ اُس نے اس لڑکی کو اپنا کر ظلم کیا۔اتنی نازک سی معصوم دل ودماغ کی مالک یہ یقیناً اتنے بڑے صدمے کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی ۔یہ سوچوں کی جن گھمن گھیریوں میں اُلجھی رہتی ہے انہیں وقت کے ساتھ ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔لیکن مصیبت تو یہ بھی ہے کہ اُسے مجھ پر اعتماد نہیں۔یہ نہیں جانتی کہ میں اس کے لیے کیا کر رہا ہوں؟ کیا سوچ رہا ہوں؟

تب وہ جھکا اُس نے چاہا کہ وہ اس کی گردن پر پیار کرے۔ پیشانی پر بوسہ دے پھر اُسے آواز دے اور جب اس کے ہونٹوں نے اس کی گردن کو چھوا۔ یک لخت اس نے آنکھیں کھول دیں اور تیز آواز میں کہا۔

''خدا کے لئے میرا گلا نہ گھونٹنا۔''

رحمان یوں پیچھے ہٹا جیسے اُسے بجلی کا کرنٹ لگا ہو۔ وہ حواس باختہ سا ہو گیا۔ چند لمحوں بعد خود پر قابو پایا۔ تعجب اور حیرانگی سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''مجھی کیا بات ہے؟''

وہ برف کی طرح ٹھنڈی ہو گئی۔ اُس کے ہونٹ سفید ہو رہے تھے۔ آنکھیں پتھرائی ہوئیں یوں جیسے نزع کا عالم ہو۔ گھبرا کر اُس نے اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹا اور کمرے میں لے آیا۔ بیڈ پر لٹانے کے بعد اس نے ڈاکٹر کو فون کیا۔

ڈاکٹر آیا تفصیلی معائنے کے بعد بولا۔

''انہیں کوئی شدید صدمہ پہنچا ہے۔''

رحمان کو اس بات پر حیرت تھی کہ اس نے یہ کیوں کہا ہے؟ میرا گلا نہیں گھونٹنا۔ اس کا پس منظر کیا ہے؟ یقیناً کوئی ایسی بات ضرور ہوئی ہے جس نے اِس کے ذہن پر اس درجہ اثر کیا ہے کہ مریض بن گئی ہے۔

وہ جب ڈاکٹر کو رخصت کر کے واپس لوٹا۔ برآمدے کی دوسری سیڑھی پر قدم رکھ کر اُس نے سگریٹ جلایا اور وہیں ذرا ٹھہر کر اُس نے لمبے لمبے دو کش لئے۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت گہری سوچیں تھیں۔

تب دفعتاً اُس کی چھٹی حس جاگی اور جیسے اُسے یقین سا ہو گیا کہ اولڈ ڈھاکہ والوں نے کچھ گڑبڑ کی ہے۔ وہ تیسری سیڑھی چڑھ کر برآمدے میں آ گیا۔ اب اُسے غصہ آ رہا

تھا۔اُس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''لاکھ بھی کوئی کچھ کہے یہ کس قدر احمق ہے؟ وہ خود سے بولا۔

اور جب وہ برآمدے میں چکر کاٹ رہا تھا اور سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا اندر بیڈ پر لیٹی اس بیمار لڑکی پر اس کا غصہ تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔

''لاکھ سمجھاؤ۔لاکھ واویلا کرو پر وہاں کچھ اثر ہی نہیں ہے اسکنڈلز تو بنتے ہی رہتے ہیں۔افواہیں اڑتی رہتی ہیں۔جھوٹی سچی کہانیاں گردش میں رہتی ہیں۔مگر اس کا مطلب یہ کب ہے؟ کہ انسان بغیر تحقیق کئے اُس پر ایمان لے آئے۔اور اُسے دل پر لگا کر بیٹھ جائے۔میں آخر اُسے کس طرح سمجھاؤں کہ وہ میرے لئے کیا ہے؟ میں اس کے احساسات وجذبات سے ناواقف نہیں۔جانتا ہوں؟ سمجھتا ہوں اِس جیسی حساس لڑکی کے لئے ایسا سوچنا فطری امر ہے؟ مگر شاید اُسے وقت کا انتظار نہیں۔دس دن بعد تھکا ہارا گھر پہنچا ہوں تو یہ پریشانیاں میرے انتظار میں ہیں۔

اور جب وہ دیر بعد اُس کے کمرے میں آیا۔وہ دونوں ہاتھ دائیں رخسار کے نیچے رکھے کروٹ لئے لیٹی تھی۔اُس کی آنکھیں کھلی تھیں۔اور ان کھلی آنکھوں سے کبھی کبھی آنسوؤں کا کوئی قطرہ اُس کے گالوں پر ڈھلک پڑتا۔

وہ خاموشی سے آکر بیڈ کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔نوکر نے چائے لاکر رکھی۔اُس نے چائے بنائی۔ایک کپ اپنے لئے ایک اس کے لئے چائے پی کر سگریٹ سُلگایا۔ایک دو تین چار وہ بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔نوکر نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔بچوں کو ٹیوٹر پڑھا کر جا چکا تھا۔وہ کمرے میں آگئے۔بیٹا اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولا۔

مما اب کیسی ہیں آپ؟

ٹھیک ہوں۔تم جاؤ کھانا کھاؤ۔

دونوں بچوں نے ضد کی کہ وہ اس کے ساتھ کھانا کھائیں گے۔رحمان نے ان کے ہاتھ پکڑے اور انہیں کمرے سے باہر یہ کہتے ہوئے لے گیا۔

مما کو تنگ نہیں کرو۔اُن کی طبیعت کچھ خراب ہے۔

نوکر نے اُس سے بھی کھانے کا پوچھا۔

بھلا کچھ کھانے کو جی چاہ رہا تھا۔اس کے تو آنسو ہی بہنے بند نہیں ہو رہے تھے۔بچوں کو سُلا کر گیارہ بجے کے قریب وہ پھر کمرے میں آیا۔دوبارہ کُرسی پر بیٹھا۔سگریٹ پھر جلنے اور بُجھنے لگے۔

اس کا جی چاہتا تھا وہ اُسے اپنے بازوں میں سمیٹے۔اُس سے وجہ پوچھے۔صورت حال کی اُس پر وضاحت کرے۔اُسے تسلی و تشفی دے پر وہ تو گم سم چپ چاپ بیٹھا اپنا سارا اُبال غالباً سگرٹیوں پر اتار رہا تھا۔

عین اُسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔فون سُنتے ہی وہ بہت فکر مند نظر آیا یکدم مخاطب کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''مگر دیکھو۔بچوں کو لے جانا کس قدر مشکل ہوگا؟''

پتہ نہیں اس کے جواب میں کیا کہا گیا تھا۔بہت دیر ریسیور اُس کے کانوں سے لگا رہا۔اس کے چہرے پر تذبذب کی کیفیات نمودار ہوتی رہیں۔آخر میں اُس نے صرف اتنا کہا۔

''ٹھیک ہے میں پہنچ رہا ہوں۔''

پھر وہ اُس کے پاس آیا۔بیڈ پر بیٹھا اور آہستگی سے بولا۔

تم سے تفصیلی باتیں واپسی پر ہوں گی۔طاہرہ کی والدہ کلکتے میں شدید علیل ہیں

بچنے کی امید بہت کم ہے۔بچوں کو دیکھنا چاہتی ہیں۔میں نے احتشام کی بیوی سے کہا تھا کہ بچوں کو کہاں گھسیٹتے پھریں گے۔مگراس کا کہنا ہے کہ اماں بچوں کیلئے بہت تڑپتی ہیں۔

وہ چلے گئے اوراُسے اذیت ناک تنہائیوں سے کھیلنے کے لئے اکیلا چھوڑ گئے ان تنہائیوں نے اس کے اُلجھے دماغ کواور بھی اُلجھایا۔گھر بھائیں بھائیں کرتا تھا۔بچوں کے وجود سے جو رونق اور گہما گہمی تھی وہ بھی مفقود ہوگئی۔

وہ صبح کی نکھری ہوئی دھوپ میں ایک ایک کمرے کا چکر کاٹتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"یہ سب ایک ہیں۔میں ہی ان کے درمیان اجنبی ہوں اور سدا اجنبی رہوں گی۔ان کی خوشیاں ان کے غم دکھ درد بھی مشترکہ ہیں۔"

ایک دن وہ نازی اور ثریا کے ہاں گئی۔ڈھاکہ میں وہی دونوں بہنیں اس کی سچی غمگسار تھیں۔لیکن اس بار وہ ان سے بھی کوئی بات نہ کرسکی۔ثریا کے بار بار پوچھنے پر بھی بس ٹال مٹول سے کام لے گئی۔

اس وقت کمرے میں ریڈیو بج رہا تھا۔

نورجہاں غزل سرا تھی۔

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

وہ کرسی پر بیٹھی جام ہوگئی تھی ہاتھ نیچے جھول رہا تھا۔اوراس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اُسے اُوپر کرسکے۔

دونوں نے دوپہر کے کھانے پر روکا۔یہ بھی کہا کہ رات کوفلم دیکھنے چلیں گے۔پر وہ نہیں رُکی۔

طوفانی فیصلہ جو کر بیٹھی تھی۔

باب نمبر ۳۱:

سلور گرے بالوں والے اُس اجنبی ٹیکسی ڈرائیور نے یہ قطعاً جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اُڑی اُڑی رنگت والی وہ لڑکی جو حد درجہ ہراساں اور خوف زدہ سی نظر آتی ہے جس کا پہناوا اُسے برصغیر کے کسی ملک کا ظاہر کرتا ہے اس کی مدد کی محتاج تو نہیں۔

سینٹ جانز ورڈ۔

اُس نے کہا۔اور شیشے سے باہر دیکھنے لگا۔

آواز میں بے نیازی اور انتہائی لاتعلقی کا سا عنصر نمایاں تھا۔شیشے سے باہر دیکھنے کی حرکت بھی اسی احساس کی غماز تھی۔

اُس کی آنکھوں میں پانی اُتر آیا تھا۔بیگ کو ہاتھ میں پکڑتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا۔اس کا شکریہ ادا کیا۔بل کی ادائیگی کی اور سڑک پر آ گئی۔

صبح صادق کا اُجالا پھیل رہا تھا۔آسمان صاف تھا اور ستارے چمک رہے تھے۔یہ لندن سے اُس کی پہلی ملاقات تھی۔وہ دُھند کہر اور بادلوں میں ڈوبا ہوا نظر نہیں آیا تھا۔

راستے میں جابجا کھلے خوبصورت پھولوں نے اِک ذرا اُس کی توجہ کو کھینچا تھا۔آنکھوں میں کھُلنے والے رنگوں کے پھول جن کے نام اُسے نہیں آتے تھے پر جو بے اختیار نظروں کو لُبھا رہے تھے۔عالیشان فلیٹ جن کے رنگ و روغن راہگیروں کو متوجہ کرتے تھے۔

کشادہ اور خوبصورت سڑک پر چلتی گئی۔اپنی دُھن میں آگے بڑھتی گئی۔سوچوں میں کھوئی ہوئی۔کسی سے رُک کر کچھ پُوچھنے کی ضرورت مند بھی نہ ہوئی۔چال میں شکستگی تھی اور جیسے وہ اپنا وجود گھسیٹ سی رہی ہے بڑا واضح تھا۔

اخبار بیچتے نوعمر لڑکے بھاگے جارہے تھے۔دودھ تقسیم کرتی گاڑی بھی زن سے اس کے پاس سے گذر گئی۔دھوئیں کے بگولوں کا نہ اڑنا اُس کے لئے تعجب کا باعث تھا۔ایسی خوشبوؤں کو سونگھنے کی بچپن سے عادت جو تھی۔

روشنی خاصی پھیل گئی تھی۔تھکاوٹ بھی بہت زیادہ محسوس ہونے لگی تھی۔ایک ریسٹوران میں بیٹھے ایک بُوڑھے کو اُس نے ایڈریس دکھایا۔ایڈریس پڑھ کر وہ بولا۔

آپ تو آگے آگئی ہیں۔مطلوبہ جگہ پیچھے ہے۔

اور وہ پھر چلی۔جائے مقام آئی۔لفٹ میں داخل ہوئی۔چوتھی منزل کے لئے بٹن دبایا۔باہر نکلی۔ایک خوبصورت راہداری جس کی اگلی طرف بالکونی تھی پر نظر پڑی۔مختلف فلیٹز کے دروازے بند تھے۔

بائیں ہاتھ اُس کی بہن کے نام کی تختی تھی۔ڈاکٹر تہمینہ شمشیر علی۔اُس نے زیر لب پڑھا۔اُس کی دو اور ساتھیوں کے نام تھے۔

میری بہن جس کے سامنے میں اعتراف جُرم کرنے حاضر ہورہی ہوں۔وہ ساکت کھڑی تھی۔خود سے پوچھتی تھی۔

" کیا میں اعتراف جُرم کرنے حاضر ہوئی ہوں؟یا قلبی سکون حاصل کرنا میرا مقصد ہے۔لیکن اتنا میں جان گئی ہوں کہ یہ مجھے یہاں بھی نہیں ملے گا۔"

اُس کے دائیں ہاتھ کی پہلی دو اُنگلیاں حُروف پر پھرنے لگیں۔ہاتھ پھیلتا گیا۔پھر اُس نے کال بیل کو اپنے حلقے میں لے لیا۔اُس کا سر دروازے سے ٹکا ہوا تھا۔آنکھیں بند تھیں۔تین دن سے اناج کا ایک دانہ اس کے اندر نہیں گیا تھا۔سفر میں بھی وہ نڈھال گردن لڑھکائے سیٹ پر نیم دراز رہی۔خوشکل سٹیورڈ اور خوبصورت ایر ہوسٹس بھی آتے جاتے اِس پژمردہ سی لڑکی کا نوٹس لئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔دونوں نے ایک دوسرے

سے کہا تھا۔

" کیسی پیاری لڑکی ہے؟ پتہ نہیں کیا بات ہے؟ کیوں اتنی پریشان ہے؟

دونوں نے اُس پر خصوصی توجہ دی تھی ۔ناشتہ اور کھانا اُس کے سامنے سے ویسے ہی اٹھانا پڑا تھا۔بس وہ وقفوں سے اُسے اناناس کا رس پلاتے رہے۔ساتھ بیٹھی سوئس خاتون فکرمند رہی۔تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُس کا احوال پُوچھنا نہ بھولتی۔کبھی کبھی اس کے ماتھے اور رخساروں پر بھی ہاتھ پھیرتی۔

جہاز بیروت اور جینوا کے بین الاقوامی ہوائی اڈوں پر ٹھہرا۔یونان کے تاریخی شہر ایتھنز اور سوئزرلینڈ کی خوبصورت وادیوں اور پہاڑیوں کو لوگوں نے خوش ہو کر دیکھا اور گو وہ کھڑکی کے ساتھ بیٹھی تھی پر بلندی سے ان نظاروں کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھنے کے لئے بھی اُس نے سر سیدھا نہ کیا۔

اور لندن ایرپورٹ پر جہاز سے اُترنے والی وہ آخری مسافر تھی۔ایر ہوسٹس نے ایک بار پھر کہا۔

"ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کی پریشانی نہ جان سکے اور نہ اسے کم کرنے میں آپ کے مددگار ثابت ہوئے۔پر آپ کو اتنا غمگین اور افسردہ دیکھ کر ہم خود بھی پریشان رہے۔

اُس کے ہونٹوں پر پیاری سی مسکراہٹ دوڑی تھی ۔اُس نے اُس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

"کچھ غم صرف اپنے لئے ہوتے ہیں۔"

اور پھر کال بیل بجی ۔گاؤن میں لپٹی لمبے بالوں کو پشت پر بکھیرے اُس کی بہن نے دروازہ کھولا ۔اُس پر نظر پڑتے ہی اُس کی آنکھیں پھٹاؤ کی حد تک پھیل گئی تھیں۔

''نجمی تم۔''

ہکلاتے ہوئے بس اتنا ہی تو کہ سکی۔

پھر اُس کے دونوں بازو پھیلے اوران بازوؤں میں وہ سمائی۔اُس کے سینے سے اس کا چمٹاؤ کچھ ایسا تھا جیسے کوئی بچھڑا ہوا بچہ اپنی ماں کے گلے لگتا ہے۔اُس کے ہاتھوں نے اُس کی کمر کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور وہ زارزار روتی تھی۔

اُس کا وجود ہچکیوں سے لرز رہا تھا۔اُس کی اپنی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔وہ اس کے رخساروں پر بالوں پر بوسوں کی بوچھاڑ کر رہی تھی۔

پھر اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹے وہ اندر لے آئی۔بیڈروم میں اُسے بستر پر لٹاتے اور اُس پر کمبل ڈالتے ہوئے اُس نے اُس کے آنسوؤں کو صاف کیا۔اُس کا ماتھا چوما۔اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ دو قطرے پھر گرے جو اُس کے سینے پر پھیلے گاؤن میں ہی کہیں جذب ہو گئے۔

''آرام کرو۔میں تمہارے لئے ناشتہ بنالاؤں۔''

پورٹر دودھ کی بوتلیں جانے کہاں رکھ گیا تھا۔وہ اُس سے بہت تنگ تھی۔روز کوئی نئی جگہ ڈھونڈھ لیتا۔فون کیا تھوڑی سی ڈانٹ دی اور کچن میں چلی گئی۔

''کم عمری میں اسے گھر سے دُور بھیج کر ہم نے غلطی کی۔''

مگر جب وہ سینکے ہوئے توسوں کو پلیٹ میں رکھ رہی تھی۔اُس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''ہم لوگ بھی تو کنوئیں کے مینڈکوں کی طرح پرورش پاتے ہیں۔کھلی ہوا میں سانس لیتے ہی حالت غیر ہو جاتی ہے۔''

اور جب وہ اس کے لئے کافی بنا رہی تھی۔اُس کے چہرے پر فکرمندی کی علامات

محسوس ہو رہی تھیں۔اُس نے ایک بار پھر اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

یہ کیسے آئی ہے؟ اپنی غلطی پر شرمسار ہے۔میرے خط نے اُسے احساس دلایا ہے۔خود وہ اُلجھی سی گئی تھی۔کوئی بھی اندازہ لگانا اُس وقت ممکن نہ تھا۔

اُس نے زبردستی اُسے ناشتہ کروایا۔پھر آرام کرنے کا کہتی ہوئی وہ خود تیار ہونے کے لئے چلی گئی۔آج اُس کا اپریشن ڈے تھا۔وہ اسپتال سے غیر حاضر نہیں ہو سکتی تھی۔

اور ایسی ابتر حالت میں بھی اُس نے بڑی بہن کو سر سے پاؤں تک دیکھا تھا۔وہ عین اس کی نظروں کے سامنے کھڑی تھی۔تنگ مہری کی گرم شلوار کوٹ اور گرم سکارف میں لپٹی۔

''یہ لندن میں رہ کر بھی گنوار ہی ہے۔کوئی نفاست اور دیدہ زیبی ہے اس کے لباس میں۔''

اُسے ایسا ضرور سوچنا اور خود سے کہنا چاہیے تھا کہ جس زندگی سے وہ روشناس ہوئی تھی۔اس میں فیشن اور کپڑے کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔اور یہ دونوں اُس کی کمزوری تھیں۔رحمان نے نے دنیا جہاں کے بہترین ملبوسات اُس کے سامنے ڈھیر کر دیئے تھے۔اعلیٰ درجے کے کاسمیٹکس سے میزیں بھر دیں تھیں۔مہنگی اور نفیس جیولری سے اُس کو سجا دیا تھا۔ڈاکٹر تہمینہ شمشیر علی جیسی سادھو یہ سب کیا جانے۔لاکھ بھی وہ گذشتہ تین سالوں سے لندن میں رہ رہی تھی۔

وہ اس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔اس کے لہجے میں ممتا کی مٹھاس تھی۔اُس نے کہا تھا۔

''سو جانا۔سفر کی تھکاوٹ دُور ہو جائے گی۔ضرورت پڑے تو مجھے فون کر لینا۔میں تمہاری خیریت دریافت کرتی رہوں گی۔دل اُکتائے تو بالکونی میں کھڑی

ہو جاتا ۔وہاں کھڑے ہونا اور لوگوں کو دیکھنا لطف دیتا ہے ۔انسان کچھ دیر کے لئے سب کچھ بھول جاتا ہے ۔ہر قسم کی پریشانی اور تفکر سے آزاد ہو جاتا ہے ۔آج تو یوں بھی بڑا مبارک دن ہے ۔موسم خوشگوار اور نکھرا ہوا ہے ۔ایسے دن تو لندن کی زندگی میں عید جیسی گہما گہمی اور خوشی لیکر آتے ہیں ۔''

ہاں اگر کچھ کھانے کو جی چاہے تو کچن میں چلی جانا ۔سبھی کچھ موجود ہے ۔

پھر وہ اس پر جھکی اس نے اُس کی پیشانی پر پیار کیا اور بولی ۔

میں آج چھٹی کر لیتی پر میرا آپریشن ڈے ہے ۔

آج کل جینٹ اور مارتھا دونوں سکاٹ لینڈ گئی ہوئی ہیں ۔وہ ہوتیں تو تم انکی کمپنی یقیناً انجوائے کرتیں ۔

وہ چُپ چاپ بہن کی باتیں سُنتی رہی ۔اس کے چلے جانے کے بعد اس نے آنکھیں موند لیں اور اپنے آپ سے بڑبڑائی ۔

''سو جاؤں ۔اللہ کیسے سو جاؤں ؟پُرسکون اور گہری نیندیں میرے مقدر سے کب کی خارج ہو گئی ہیں ؟میں ذہنی الجھنوں کے ایسے بھنوروں میں پھنس گئی ہوں جن سے جیتے جی نکلنا ناممکن ہو گیا ہے ۔''

وہ دیر تک کروٹ لئے لیٹی رہی ۔غنودگی کا ہلکا سا غبار اُس پر چھا گیا اس نے رحمان کو دیکھا ۔دونوں بچے دیکھے جو اُس کے گلے میں باہنیں ڈالے اُسے اپنے درمیان ہونے والے جھگڑوں کی تفصیل بتا کر انصاف چاہ رہے تھے ۔گھر کا غربی برآمدہ بھی دکھائی دیا جہاں نوکر شام کی چائے کے لئے سامان سجا رہا تھا ۔

وہ تڑپ کر یوں اٹھی جیسے بچھو ڈنگ مار دے ۔دو آنسو ٹپ سے گود میں رکھے ہاتھوں پر گرے اور پھر ہتھیلی کی بیرونی سطح بھیگتی چلی گئی ۔

’’پرودگار میں نے کونسا جرم کیا تھا۔جس کی سزا تو مجھے اس انداز میں دے رہا ہے۔میری آنکھوں سے آنسوخشک نہیں ہوتے اور میرے دل سے درد نہیں ختم ہوتا۔‘‘

وہ اٹھ کر باہر آ گئی۔کمرہ اُسے کاٹ کھانے لگا تھا۔ریلنگ کے سہارے کھڑے ہو کر اُس نے دیکھا تھا۔

’’دنیا آباد ہے اپنے اپنے روزمرہ کے کاموں میں اُلجھی ہوئی ہے۔سامنے فلیٹ میں دو بچے کھیل رہے تھے۔اُس کے بچوں کی عمر جتنے،من موہنی سی ایک عورت ماتھے پر بندیا سجائے کاہی رنگی ساڑھی میں لپٹی انہیں بلانے آئی تھی۔ایسے ہی جیسے وہ اپنے خوبصورت سے گھر میں یونہی بنی سنوری کبھی کبھی انہیں بلانے کے لئے لان میں آیا کرتی تھی۔

دفعتاً عورت کی نگاہ اوپر اُٹھی۔بالکونی میں ایک اجنبی شکل پر نظر پڑتے ہی اُس نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ دیا تھا۔جواباً اس نے بھی ویسا ہی کیا اور ہلکی سی ہنسی اپنے لبوں پر بکھیر دی۔

"بہت خوش اخلاق اور ملنسار معلوم ہوتی ہے۔وگرنہ مصروف شہروں خاص کر لندن جیسے بڑے شہر کے لوگوں کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ اتنی انسان دوستی کا مظاہرہ کرتے پھریں۔

نیچے سرخ رنگ کی ایک ڈبل ڈیکر سکون سے گذر رہی تھی۔تنگ مہری کی پتلونیں اور چمڑے کی جیکٹوں میں نوخیز لڑکیاں تیز تیز قدم اٹھاتی سڑک پار کر رہی تھیں۔سینٹ میری اسکول کی بس ایک فلیٹ کے سامنے رُکی اور اُس میں سے تین خوبصورت گل گوتھنے سے بچے اُترے۔

بچے،گھر اُس نے آنکھیں بند کر کے سر ریلنگ سے ٹکا لیا۔

’’میرا ماضی میرے سائے کی طرح تعاقب میں رہے گا۔راستے بدل لوں اندھیروں سے روشنیوں میں آ جاؤں مگر جہاں بھی جاؤں گی یہ میرے ساتھ چلے

گا۔روشنیاں خودبخود اندھیروں میں بدلتی جائیں گی اور میں اُن میں بھٹکتی رہ جاؤں گی۔

''رحمان تم سے بچھڑ کر میں جی سکوں گی کیا؟''

وقتی نفرت اور رنجش اور غلط فہمیوں کا وہ آتش فشاں جو کواولڈ ڈھاکہ والیوں کی باتوں سے لاوے کی طرح پھٹ پڑا تھا۔اِس دُوری نے اُس پر برف کی سلیں رکھ دیں۔اب پچھتاوا شروع ہو چکا تھا۔اِس نکھری سنہری دُھوپ میں سینٹ جانز ورڈ کے اس فلیٹ کی بالکونی میں کھڑے اُس نے اپنے گھر کو یاد کیا تھا۔وہ گھر جس کی وہ رانی تھی۔خوبصورت بچوں کو دیکھ کر اُسے وہ بچے یاد آئے تھے۔جنہیں اُس نے جنا تو نہیں تھا پر جنہیں اُس نے ماں جیسا پیار دیا تھا۔سڑک پر چلتے پھرتے مردوں نے اُسے رحمان کی یاد دلائی تھی وہ رحمان جس نے اُسے ٹوٹ کر پیار کیا تھا۔

اور اُس کے دل ودماغ نے بیک وقت یہ کہا تھا۔

''رحمان ایسی گھناؤنی حرکت کا مرتکب کبھی نہیں ہوسکتا۔یہ سب اولڈ ڈھاکہ والیوں کی سازش ہے۔''

وہ کمرے میں دوبارہ آکر لیٹ گئی۔اُس کا اندر کٹنے لگا تھا۔یوں جیسے کوئی تیز دھار کے آلے سے اُنگی بوٹیاں کر رہا ہو۔

''اللہ میں کہاں جاؤں، کیا کروں۔تو نے وقت کے کس مضطرب لمحے میں مجھے تخلیق کیا تھا۔''

ٹھیک دو بجے اُس کی بہن آگئی۔آتے ہی اُس نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔کچھ کھایا؟نیند آئی۔طبیعت کیسی ہے؟

یہ جاننے پر کہ نہ اُس نے کچھ کھایا اور نہ وہ سوئی۔اُس نے فکرمندی سے اُسے دیکھتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

''پریشانیوں کو یوں اعصاب پر سوار نہیں کرتے۔چلو اٹھو نماز پڑھو۔خدا سے سکون قلب مانگو۔''

مگر اس کی طبیعت عجیب سی ہو رہی تھی۔اس نے کہا۔

''دو دن سے سفر میں ہوں۔نہا دھو کر پڑھوں گی۔''

مزید کچھ کہنے کی بجائے وہ ظہر کی نماز کی ادائیگی میں مصروف ہو گئی۔اسے یوں خضوع وخشوع سے عبادت کرتے دیکھ کر اُس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''میرا اتنا بڑا جرم اِس کی نظروں میں قابل معافی کیونکر ہو سکتا ہے؟جبکہ یہ راہبوں جیسی زندگی گذار رہی ہے۔میں اسے لاکھ سمجھانے کی کوشش کروں پر یہ کہاں سمجھے گی؟

اور جب وہ نماز سے فارغ ہوئی اُس نے کہا۔

آؤ کچھ کھانے کے لئے چلیں۔

دونوں بہنیں گاڑی میں بیٹھیں اور قریبی ریستوارن میں آگئیں اور جب ویٹر نے ان کے سامنے کافی رکھی۔ڈاکٹر تہمینہ نے کپ اٹھا کر اُسے دیکھا اور پُرسکون لہجے میں بولی۔

''کچھ اپنے بارے میں بتانا پسند کرو گی۔''

باب نمبر۳۲:

ماں نے غسل خانے سے چلاّ کر کہا تھا۔

''ڈوری ہو گئی ہو کیا؟ کب سے شور مچا رہی ہوں کہ کپڑے دے جاؤ پر تمہارے حواس جانے کہاں ٹکے ہیں۔بات کی کوئی سنوائی ہی نہیں۔

وہ گھبرائی ہوئی، پھولتے ہاتھ پاؤں سے کمرے میں اِدھر اُدھر چکر کاٹتی پھر رہی تھی۔اُسے یہ بھول گیا تھا کہ اسٹینڈ پر رکھی استری کی کی نوب اپنے آخری پوائنٹ پر ہے۔کمرے میں پھیلی ناگوار سی ہمک کا بھی اُسے احساس نہیں ہوا تھا۔

اُس نے فرنچ شیفان کی ساڑھی الگنی پر لٹکتی ہاتھ بڑھا کر کھینچی۔اس کی چار تہیں کیں۔اس میں کچھ زیادہ سلوٹیں نہیں تھیں۔اسے بغیر استری کے بھی پہنا جا سکتا تھا پر ماں کے نفاست پسند مزاج کو کیا کہتی جنہیں یوں کپڑے پر بکھری ہلکی سی شکن بھی چُبھنے لگتی۔اُس نے ساڑھی کو پھیلایا اور استری اس پر رکھ دی۔بھک سے چاروں تہوں کی دھجیاں اڑ گئیں۔

''باپ رے باپ وہ مزید بوکھلا گئی۔اب کیا کروں''بدحواسی میں اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

استری ایک طرف رکھ دی۔اُوپر سے ماں کا شور شرابا۔استری کی چمکدار سطح کپڑا چمٹنے سے عجیب کھردری سی ہو گئی ساڑھی گول گچھا کر کے اُس نے بکس کے ایک کونے میں پھینکی۔

"خداوندا ماں ملیدہ کر دے گی۔"

وہ زندگی میں نظم وضبط، رکھ رکھاؤ، طور طریقے اور باقاعدگی کی قائل تھیں۔ثریا اور نازلی جب بھی کسی پھوہڑ پن کا ثبوت دیتیں۔کوئی الٹا پلٹا کام کرتیں۔وہ پنجے جھاڑ کر ان

کے پیچھے پڑ جاتیں۔ڈھیروں صلواتیں سُناتیں۔

بہر حال اب جو ہونا تھا ہو چکا تھا اُس پر افسوس اور پچھتاوا بیکار تھا۔

الماری سے دوسری استری شدہ ساڑھی نکال کر وہ باتھ روم کی طرف بھاگی۔

''تمھیں تو کام کہہ کر بھول جانا چاہیئے۔''

ماں نے پیٹی کوٹ بلاؤز اور ساڑھی اس کے ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔پر ساڑھی پر نظر پڑتے ہی وہ بولیں۔

''ارے میں نے یہ کب مانگی تھی۔پرنٹڈ شیفان کی وہ جو الگنی پر لٹکی ہوئی ہے۔میں نے بیگم ضیا کے گھر جانا ہے۔''

''ماں اب یہی پہن لیں۔مجھے وہ مل نہیں رہی۔''

''توبہ ہے ان لڑکیوں پر ذرا سا کام کرنا پڑ جائے تو جان مصیبت میں پھنس جاتی ہے ان کی۔معلوم نہیں اگلے گھروں میں جا کر کیا کریں گی؟''

اور جب وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بچھی چھوٹی تپائی پر بیٹھی بالوں کی اُلجھی لٹیں سُلجھا رہی تھیں۔انہوں نے بیٹی سے پوچھا تھا۔

ڈاک نہیں آئی ابھی تک۔

ماں کو تنزانیہ سے چھوٹے بھائی اور بمبئی سے جیٹھ کی چٹھیوں کا انتظار تھا۔

دُبلی پتلی کھلتی رنگت والی ثریا نے یکسر لاعلمی کا اظہار کیا۔وہ چھپا گئی تھی کہ سات سمندر پار سے وہ خط آیا ہے جس کا اُسے دنوں سے انتظار تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اُسے موصول ہوا تھا اور جس نے اُسے پریشان کر دیا تھا۔

ماں دھیمے لہجے میں اُن دعاؤں کو پڑھ رہی تھیں جو اکثر اپنے بھائی کی طرف سے کوئی خیریت نہ ملنے پر پڑھا کرتی تھیں۔

پاؤں میں چپل پہنتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

آج شام جماعت خانے جانا ہے۔شہزادی سلیمہ کا ڈھاکہ کا دورہ متوقع ہے۔ استقبالیہ کمیٹی پروگرام کی تفصیلات پر میٹنگ چاہتی ہے۔تم بہانے بنانے مت کھڑی ہو جانا۔ چلنا ہے۔جماعت خانے کے کاموں کو بھی اپنی زندگی میں اہمیت دینا سیکھو۔

اس نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے چلیں گے۔''

ماں کے باہر جانے کے بعد وہ دوسرے کمرے میں چلی آئی۔دراز میں رکھا اُس نے خط نکالا۔وہ اپنی ماں کو اس خط کے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتی تھی۔اس کی یہ دوست انہیں پہلے جس قدر پیاری تھیں۔اب وہ اُس سے اتنی ہی ناخوش تھیں زندگی سے متعلق اہم فیصلوں میں اُس نے جس جلد بازی، جذباتی پن اور سُوجھ بُوجھ سے عاری فیصلوں کا مظاہرہ کیا تھا۔ماں نے اُسے ناپسند کیا تھا۔

خط کھولا اور اس کی بے چین نظریں سطور پر دوڑنے لگیں دعاؤں اور محبتوں کے اظہار کے بعد اُس نے لکھا تھا۔

"تمہیں لکھنے بیٹھی ہوں تو قریبی فلیٹ سے ٹرپٹ کی آواز بلند ہونی شروع ہو گئی ہیں۔میں نہیں جانتی یہ کون ہے؟ مگر ثریا نازلی یقین کرواتی پُرسوز دُھنیں بجتی ہیں کہ جی چاہتا ہے اپنا کلیجہ کاٹ دوں۔کہیں جنگلوں میں نکل جاؤں۔جوگ لے لوں۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے میں پکاڈلی ٹیوب اسٹیشن میں اُس گھڑی کے نیچے کھڑی تھی جس میں ساری دنیا کا وقت معلوم ہوتا ہے۔میرے دائیں بائیں انسانوں کا ایک جمِ غفیر تھا اور میں اُن میں گھری یُوریو پاکستان کا وقت دیکھ رہی تھی اور سوچتی تھی۔

''رحمان اس وقت دفتر میں ہوں گے۔بچے اسکول میں۔کریم کھانا بنا رہا

ہوگا۔اورتم یونیورسٹی کے کوریڈوز میں گھوم پھر رہی ہوگی،نازلی یقیناً اپنی ساڑھیوں پر کشیدہ کاری کے جائزوں میں مصروف ہوگی۔

اِن دنوں میں اکثر یہ خیال آتا ہے کہ کچھ لوگوں کی پیدائش کچھ مخصوص کاموں کے لئے ہی ہوتی ہے۔شاید مجھے بھی اللہ نے جلنے کڑھنے سسکنے رونے اور تڑپنے کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔کوئی لمحہ ایسا نہیں جب میرا ذہن سوچوں کی گنجل گتھوں سے آزاد ہو۔ڈھاکہ میں تھی۔تو ندامتوں کا بوجھ اٹھائے پھرتی تھی۔والدین بھائی بہن عزیز رشتہ دار عزت ذلت کے دائروں سے نکل نہ پاتی۔کیا ہوگیا ہے؟ کیا کر بیٹھی ہوں؟ جیسے ملامتی سوالوں کی سُولی پر خود کو ٹوم ڈالتی۔

انکے شفاف ماتھوں پر کلنک کے ٹیکوں کے لگنے کا ہوکا مارے ڈالتا تھا۔

ثریا میرے دماغ کی نسیں پھٹنے لگ جاتیں۔میں بلک بلک کر روتی اور تڑپ تڑپ کر اپنے آپ کو کوستی۔

اور اب جب میں اپنی بہن کی گود میں پناہ لے چکی ہوں تو بھی اذیت میں ہوں۔فرق صرف نوعیت کا ہے۔اب رحمان اور بچے محور بن گئے ہیں۔انہیں کیوں چھوڑ آئی،کیا اُنکے بغیر رہ سکتی ہوں؟

اُس خوبصورت اطالوی ریسٹوران میں کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے جب دفعتاً میری بہن نے مجھ سے یہ کہا تھا۔

''مجھے کچھ اپنے بارے میں بتانا پسند کروگی۔''

میں ساری جان سے لرزی تھی۔مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میں اُسے کیا بتاؤں اور کیسے بتاؤں۔

لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنا سب کچھ اُگل دینے پر مجبور ہو جاتا

ہے۔اُس دوپہر میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔

اور کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتے ہوئے وہ چُپ چاپ مجھے سُنتی رہی ۔اس نے میری کسی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔کسی جگہ مجھے ٹوکا نہیں ،شاید وہ چاہتی تھی میرے اندر کا اُبال باہر آجائے ۔یا شاید اُس نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

اور جب میں خاموش ہوئی میری آنکھوں میں آنسوؤں کی لڑیاں تھیں۔

ویٹرس کو بل کی ادائیگی کے بعد وہ مجھے ہاتھ سے تھام کر باہر لے آئی تھی اور اُس چمکتی سیاہ سڑک پر کھڑے ہوکر میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

تو گویا کتابِ زندگی کا ایک تلخ وشریں باب ختم ہوا۔

مگر ثریا یہ میری زندگی کا کوئی ایسا باب ہے جسے اِس آسانی سے ختم کرنا ناممکن ہے۔یہ تو مجھ پر بہت جلد منکشف ہوگیا تھا۔

میں رحمان اور اُس کے بچوں سے جُدا نہیں رہ سکتی۔وہ میری رگ رگ میں سما چکے ہیں۔

میرا ذہن بیمار ہوگیا ہے جسم میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہے۔تنہائی ہو یا بھری محفل میں اس خول سے باہر نہیں نکلتی جس میں لپٹی گئی ہوں۔میری بہن کے ایک مرہٹی فیملی سے گہرے مراسم ہیں۔ایک دن اسپتال سے آنے کے بعد اُس نے مجھ سے کہا۔

اس ویک اینڈ پر مڈہرسٹ چلیں گے۔

میرا خیال تھا یہ کوئی تفریحی جگہ ہوگی ۔مگر بعد پتہ چلا کہ یہ سینی ٹوریم ہے ۔اس مرہٹی خاندان کی ایک لڑکی نے لندن میں رہنے والے کسی سکھ سے عشق کیا۔گھر کی اکلوتی بیٹی تھی ۔والدین کٹر قسم کے تھے۔انہوں نے واشگاف لفظوں میں بیٹی پر واضح کر دیا کہ یہ تو شادی کبھی ممکن ہی نہیں ۔وہ اندر ہی اندر گھلتی رہی ۔بیماری کے جراثیم پھیلتے گئے اور ایک

دن مڈ ریسٹ پہنچ گئی۔

میں نے یہ سب سُنا تو جانتی ہو میرے دماغ کی پہلی سوچ کیا تھی؟

یقیناً میں بھی ایک دن کسی نہ کسی سینی ٹوریم پہنچ جاؤں گی۔

میں نہیں جانتی میری بہن اتنے زور شور سے مجھے وہاں کیوں لے جارہی ہے؟ کیا وہ کہے بغیر مجھے یہ سمجھانا چاہتی ہے کہ عشق کرنے والی حساس لڑکیوں کا انجام یہی ہوتا ہے کہ وہ بستر پر موت کا انتظار کرتی ہیں۔

ہم کوئی سہ پہر کے قریب چلے۔مڈ ریسٹ کو جانے والی سڑک پر درخت ہواؤں سے جھوم رہے تھے۔آسمان ابر آلود تھا اور رفضا کا حُسن چار سو جلوے بکھیر رہا تھا لیکن میرے دل پر چھائی ویرانی ایسی گھنیری تھی کہ اُسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر میری بہن بیٹھی تھی۔دفعتاً اُس نے مجھ سے پوچھا۔

تجھی تمہیں گاڑی چلانی تو آتی ہوگی۔چلاؤ گی۔

لیکن میں نے انکار کردیا۔ڈرائیونگ کے لئے جس یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجھ میں کب ہے؟ خوامخواہ گاڑی کسی درخت سے دے ماروں اور حادثے کا باعث بن جاؤں۔

ہینرل میسر کے جنگل پر رات کا اندھیرا چھا رہا تھا۔یہ کئی گھنٹوں کا سفر تھا۔گاڑی مڈریسٹ کی طرف مڑی تو سامنے سینی ٹوریم کی شاندار عمارت رات کے اندھیرے میں برقی روشنیوں سے جگمگا رہی تھی۔ثریا مڈریسٹ کا سینی ٹوریم اتنا پُر فضا اور خوبصورت ہے کہ بے اختیار میں نے سوچا۔

''اگر میں یہاں آجاؤں تو یہ کچھ اتنا بُرا نہ ہوگا۔''

گیلریاں شفاف، آڈیٹوریم حسین، کمرے شاندار، اور اُن میں رہنے والے

مریض قابلِ دید۔ تم یقین نہیں کرو گی کہ وہ لڑکی کس قدر خوبصورت تھی۔ میری بہن کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ دیدی دیدی کہتے ہوئے اُس کے ہونٹ خشک ہوئے جاتے تھے۔ وہ کسی طرح بھی مریض نظر نہیں آتی تھی۔ چہرے پر سُرخی کی جھلک تھی۔ میں حیرت زدہ تھی۔ مگر اس کا چارٹ دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بیماری کی کس سٹیج پر ہے۔

لندن کی مصروف اور ہماہمی سے پُر زندگی میں سے تھوڑا سا وقت کسی کیلئے نکال لینا بہت بڑی قربانی ہے۔ لڑکی اِس بات کو سمجھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اتنی خوش تھی کہ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ میری بہن کے لیے کیا کرے؟

تم بتاؤ ثریا نازلی رحمان اور بچے کیسے ہیں؟ ماں یقیناً کہتی ہوگی کہ رحمان سے شادی کر کے میں نے غلطی کی اور اب لندن جا کر اس سے بھی بڑی غلطی کی۔

ثریا انسان تو خطا کار ہے۔ سکون نہ مجھے ڈھاکہ میں تھا اور نہ ہی یہ لندن میں حاصل ہے۔ چند دن ہوئے میں رابرٹ سٹریٹ میں سے گزر رہی تھی۔ میں نے دیکھا ایک اُدھیڑ عمر کے مرد کا ہاتھ ایک خوبصورت جوان لڑکی نے پکڑا ہوا تھا اور وہ تیز لہجے میں اُس سے کہتی جاتی تھی۔

چھوٹے حروف میں لکھنا ہے۔

IT IS BETTER TO BE THE QUEEN OF AN OLD MAN RATHER TO BE THE SLAVE OF A YOUNG MAN.

اس لڑکی کی صاف گوئی، جُرات اور بے باکی مجھے پسند آئی تھی۔ ایک پل کیلئے میرا بھی جی چاہا کہ میں بھی چلّا چلّا کر کہوں کہ میں نے کسی کو جی جان سے پسند کیا ہے۔ اُسے چاہا بھی ہے۔ قُربتوں میں اُس کے ساتھ شریک ہوئی ہوں، مگر اپنی سوسائٹی کے خود ساختہ اصولوں سے خائف ہوں اور اس چاہت کا برملا اظہار کرنے سے قاصر ہوں جو مجھے اُس

سے ہے۔

میں کتنی ڈرپوک ہوں، کس قدر بزدل ہوں۔

باب نمبر۳۳:

''کس سے ملنا ہے آپ کو؟''

کہنا پُوچھنا تو یہی تھا۔ پر دروازے کے پٹ کو ہاتھوں میں پکڑے اور اُسے دیکھتے اُس کی زبان جیسے کچھ بولنے سے انکاری ہوگئی تھی۔ ہاں البتہ آنکھوں نے کُھل کُھلا کر اس کا اظہار کر دیا تھا۔

اطلاعی گھنٹی کے بجانے کا انداز مقامی لوگوں جیسا تھا۔اس نے رین کوٹ وارڈروب سے نکالتے ہوئے جھنجھلا کر خود سے کہا تھا۔

"اِس ماریا کی بچی کو بھی ہر جگہ جلدی پہنچنے کا مالیخولیا ہے۔اب دیکھو وقت سے پہلے ہی آ دھمکی ہے۔جینٹ اور مارتھا دونوں ڈیوٹی پر ہیں۔چیزوں کا کھلارا پڑا ہے سوچا تھا اُن کے آنے سے پہلے انہیں سمیٹ لوں گی۔صفائی بھی کرنا تھی۔اب سب کچھ یونہی چھوڑ چھاڑ کر جانا پڑے گا۔"

دروازہ کھولا اور اپنے سامنے ہاتھوں میں بریف کیس پکڑے ایک پُرکشش سمارٹ سے مرد کو دیکھا جو پاکستانی تھا یا پھر ہندوستانی۔

دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے تھے۔وہ دیکھتی تھی جب اُس نے کہا تھا۔

''مجھے اندر تو آنے دیجیئے۔اتنا کڑا نظریاتی احتساب اطمینان سے کریئے گا۔''

تھوڑی سی شرمندگی تھوڑی سی خجالت تو ضرور محسوس ہوئی۔پر ساتھ ہی ڈھٹائی پن پر غصہ بھی آیا۔

ہاں البتہ اُس کے لہجے میں چھلکتا بھرپور اعتماد تھوڑا مرعوب بھی کر گیا۔ذرا پیچھے

ہٹی اور اُسے نشست گاہ کا راستہ دکھایا۔ وہ صوفے پر بیٹھا۔ بالوں پر پھوار سی پڑی ہوئی تھی جسے اُس نے رومال سے صاف کیا۔ کوٹ اُتار کر صوفے کے بازو پر رکھا اور خود سے قدرے فاصلے پر بیٹھی رائل بلیو سوٹ اور ہمرنگ شال میں لپٹی لڑکی کو غور سے دیکھا جو اُس کی ایک ایک حرکت کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔

''اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ ڈاکٹر تہمینہ شمشیر علی ہیں۔''

''جی میں تہمینہ ہی ہوں۔'' اُس نے کسی قدر آہستگی سے کہا۔

''مجھے اپنا تعارف کروانا چاہیے یا آپ جان گئی ہیں۔''

چند لمحے سر جھکائے رکھنے کے بعد اُس نے گردن اُوپر اٹھائی تھی اور اُس لڑکی جو گہری تنقیدی نگاہ سے اُس کے جائزے میں مصروف تھی سے مخاطب ہوا تھا۔

اور تہمینہ نے متانت آمیز سنجیدگی سے گیند کو اُس کے کورٹ میں پھینک دیا تھا۔

''تعارف کروائیں گے تو معلوم ہوگا۔''

لمحے بڑی کاٹ والے تھے۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

"اس احمق لڑکی نے مجھے کس جہنم میں دھکیل دیا ہے۔"

''نجمی کہاں ہے؟''

ڈاکٹر تہمینہ کو محسوس ہوا تھا جیسے اُس کا تیزی سے دھڑکتا دل ساکت ہو گیا ہے۔ اُس کی پیازی رنگت یکلخت سفیدی میں بدل گئی تھی۔

رحمان نے اِسے محسوس کیا تھا کہ جب وہ بولی تھی اُس کی آواز میں خفیف سی لرزش بھی تھی۔

''وہ میرے چھوٹے بھائی کے پاس امریکہ گئی ہے۔ اُس کا کینیڈا اپنے بڑے بھائی کے پاس جانے کا بھی پروگرام ہے۔ شاید اُسی طرف نکل گئی ہو۔ کیونکہ ہفتہ بھر سے

مجھے اس کا فون نہیں آیا۔''

''آپ مجھے وہاں کے ایڈریس دے دیجئے۔میں اُسے لے آؤں گا اور آپ کے بھائیوں سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔''

ڈاکٹر تہمینہ ابھی جواب کے کومگو میں تھی کہ عین اُسی وقت بیل بجی۔ماریا اندر آئی۔ماریا لبنان کی عیسائی لڑکی تھی اور کنگز کالج میں تہمینہ کے ساتھ ہی پڑھتی تھی۔لندن میں اقبال جینتی منائی جارہی تھی وہ ڈاکٹر تہمینہ کو ساتھ لے جانے کیلئے آئی تھی۔بڑی بروقت آمد تھی ماریا کی۔معقول اور موزوں عذر سوچنے اور اُسے پیش کرنے کے لئے وقت مل گیا تھا۔

گھر میں ایک اجنبی صورت کو بیٹھے دیکھ کر علیک سلیک ہوئی۔تہمینہ نے اُس کا تعارف ضرور کروایا مگر نہ بھی کے شوہر اور نہ ہی بہنوئی کی حیثیت سے۔بس اپنے کسی میل ملاقاتی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا گیا۔اُن کے عزیز ہیں پُوربو پاکستان سے آئے ہیں۔

ماریا پُوربو پاکستان میں دلچسپی رکھتی تھی۔وہاں کا سُن کر صوفے پر بیٹھ گئی اور باتیں کرنے لگی۔

تہمینہ موقع غنیمت سمجھتے ہوئے اُٹھ گئی۔اُس نے فوراً چیزوں کو سمیٹا۔چائے بنائی۔پیش کی۔کپڑے بدلے اور پھر معذرت کرتے ہوئے بولی۔

''آپ آرام کیجئے۔میں جلدی لوٹ آؤں گی۔جانے کا ارادہ تو نہ تھا مگر کچھ پاکستانی اور ہندوستانی لوگوں نے جو میرے مریض بھی ہیں مجھے اس تقریب میں شامل ہونے پر بہت مجبور کیا ہے۔مجھے زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے لگیں گے ہاں آپ کا کچھ کھانے کو جی چاہے تو پینٹری میں بھی کچھ موجود ہے۔''

اُن کے جانے کے بعد وہ اٹھا اُس نے اپنی پسند کی کافی بنائی۔پی اور پھر خوابگاہ میں آکر بستر پر لیٹ گیا۔

یہ تو اِس مختصر سے وقت میں ہی اُسے اندازہ ہو گیا تھا۔ کہ وہ اُسے نجمہ کے شوہر کی حیثیت سے قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اس کا بھی قوی امکان ہے کہ وہ اُسے ایڈریس ہی نہ دے۔ بقول اُس کے وہ امریکہ اور کینیڈا اپنے بھائیوں کے پاس ہے۔ تو پھر؟

اُس نے کروٹ بدلی۔ یہ صورت اُس جیسے دبنگ بندے کیلئے انتہائی ناپسندیدہ تھی۔

"احمق لڑکی نے اپنے آپ کو اور مجھے کن گھمن گھیریوں میں اُلجھا دیا ہے۔ یہ سب میرے مزاج کے بالکل برعکس ہے۔ تمہاری اس بہن کے سامنے مجھے وضاحتیں دینی پڑیں گی۔ جو میں قطعی دینا پسند نہ کروں گا۔"

وہ بڑا مضطرب سا تھا۔ دائیں بائیں پہلو بدل رہا تھا۔ کبھی چھت کو دیکھتا اور کبھی دیواروں پر نظریں جما لیتا۔ پھر وہ خود سے باتیں کرنے لگا۔

"تم اگر صرف میری ضرورت ہی ہوتیں تو میں اپنے دل پر پتھر رکھ لیتا مگر تم میرے بچوں کی وہ مجبوری ہو جس نے اُنہیں اٹھ اٹھ آنسو رُلا دیا ہے۔ اتنی کمی تو انہوں نے اپنی ماں کی بھی محسوس نہیں کی جتنی وہ تمہاری کر رہے ہیں۔ وہ تو جیسے اب ممتا سے محروم ہوئے ہیں۔ بیٹی ہر سانس کے ساتھ تمہارا نام جپتی ہے۔ بیٹا ہر آن تمہیں پکارتا ہے۔ تم جس طرح چلی آئیں میں کبھی تمہارے پیچھے نہ آتا مگر بچوں نے میری خودداری اور آن کو کچل دیا ہے۔"

وہ سو گیا۔ جاگا اُس وقت جب برتنوں کا ہلکا ہلکا شور گھر میں بکھرا ہوا تھا اور کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو سارے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔

کھانا دونوں نے اکٹھے کھایا۔ زیادہ وقت خاموشی رہی۔ رحمان اُس سے پیشہ ورانہ سوالات کرتا رہا جن کے جواب وہ متانت سے دیتی رہی۔ دوسری کوئی بات نہیں ہوئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ قصداً اِس موضوع پر گفتگو سے گریز کر رہی ہے۔ مگر کب تک بات

نہ ہوتی۔وہ جب لاؤنج میں آئے۔اور کافی بھی پی چکے تب اس نے کہا۔

''آپ مجھے ان کے ایڈریس دے دیجئے۔تاکہ میں بی اے او سی یا پان امریکن کی کسی بھی فلائٹ سے چلا جاؤں۔

اُس نے اِس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔چُپ چاپ اپنے سامنے دیکھتی رہی۔جب خاموشی ناگوار اور بوجھل محسوس ہونے لگی۔تب اُس نے ایک بار پھر کہا۔

''میں نے آپ سے کچھ کہا ہے تہمینہ۔میں آپ سے تعاون کا متمنی ہوں۔''

''میں نہیں چاہتی کہ جس صدمے سے میں دوچار ہوئی ہوں میرے بھائی بھی اُسی صورت کا سامنا کریں۔''

''آپ حقائق کا سامنا کھلی آنکھوں سے کریں۔جو کچھ ہو چکا ہے۔اُس پر افسوس کی بجائے غور کریں کہ آپ نے صورت حال سے اب کیسے نپٹنا ہے۔''؟

اُس کا چہرہ غصے سے سُرخ ہوگیا۔وہ قدرے تیز آواز میں بولی۔

''آپ خاصے سمجھدار اور معقول آدمی نظر آتے ہیں۔نجمہ جیسی جذباتی اور احمق لڑکی ہی ٹریپ کرنے کے لئے رہ گئی تھی۔''

''ٹریپ۔''

اس بار اُس کا چہرہ سُرخ ہوا اور وہ تند آواز میں بولا۔

''معاف کیجئے گا۔میں نے اُس سے شادی کی ہے اور وہ میری بیوی ہے رکھیل یا محبوبہ نہیں ہے۔''

''شادی۔''

ڈاکٹر تہمینہ کے ہونٹوں پر زہرخند ہنسی اُبھری۔

اس ہنسی میں رحمان کو اپنی تذلیل نظر آئی تھی۔

''یوں شادی ہوتی ہے کہ جنم دینے والے ماں باپ لاعلم، محبت کرنے والے بہن بھائی بے خبر، عزیز رشتہ دار ناواقف۔

دُنیا بہت آگے جا رہی ہے ڈاکٹر تہمینہ۔ آپ لندن میں رہتے ہوئے بھی اسی خول میں بند ہیں اِس خول سے باہر آ جائیں۔

''میں اسی خول میں رہتے ہوئے یہاں تک پہنچی ہوں۔ اس ماڈرن دنیا کے طور طریقوں کی حوصلہ افزائی میرے بس کی بات نہیں۔ آپ لوگوں کے کیا رواج ہیں۔ نہیں جانتی۔ مجھے تو صرف اتنا پتہ ہے کہ ہم جیسے نچلے متوسط طبقے کے لوگ اور ہماری خاندانی حدیث۔ رواج میں بیٹیاں خاندان کا مان ہوتی ہیں۔ وہ چاہنے والوں کی دعاؤں کی چھاؤں میں رُخصت ہوں تو اُسی میں سب کی نیک نامی ہوتی ہے۔ آپ اور ہم کوئی یورپ کے باسی نہیں کہ ایسے اقدامات کو سراہنا شروع کر دیں۔ ہم لاکھ بھی ترقی پسند ہو جائیں پھر بھی اس سوسائٹی سے ناطہ نہیں توڑ سکتے جس میں بڑھے پلے ہیں۔

وہ باتیں کرتے کرتے رُک گئی۔ اُس کا چہرہ وفورِ جذبات سے لال بوٹی ہو رہا تھا۔ اس کی آواز میں تلخی تھی۔ وہ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد پھر بولی تھی۔

''آپ نے صرف اپنے مفاد کو مدِنظر رکھا اور اُس بوڑھے باپ کے سفید بالوں کا کوئی خیال نہیں کیا جس کی نجمہ بیٹی ہے۔''

وہ پھر خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر بعد پھر بولی۔

لگتا تھا جیسے وہ آہستہ آہستہ اپنے دل کی اُس گھٹن اور رکھڑ اس کو نکال رہی ہے جو مہینوں سے اُس کے دل پر ڈیرے ڈالی بیٹھی تھی۔

آج آپ میرے پاس آئے ہیں۔ کیا پہلے نہیں آ سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے میں اس سلسلے میں آپ کو بہتر مشورہ دیتی۔

"محبت اور جنگ میں سبھی کچھ جائز ہے۔ میں نے اُسے پسند کیا تھا۔چاہا تھا۔حالات مجھے جس موڑ پر لے آئے تھے۔اُن کے پیش نظر مجھے اُس سے شادی کرنی پڑی۔

جی ہاں باپ کی پگڑی پاؤں میں روند کر۔آپ سوچ بھی نہیں سکتے ہمارا تعلق کیسے کٹر اور دقیانوسی گھرانے سے ہے۔رشتے دار تو ہمارے باپ کا سر ہمیشہ کے لئے اِس طعنے سے ہی جھکا دیں گے کہ بڑا لڑکیوں کو پڑھانے چلا تھا۔ناک کٹوا دی۔

''میں آپ سے اُلجھنے کے لئے تیار نہیں۔اپنی بہن اپنے پاس رکھیئے۔میرے جذبے اگر صادق ہوئے تو مجھ تک وہ ضرور پہنچے گی۔''

اور اتنا کہہ کر وہ اٹھا۔بریف کیس پکڑا اور باہر نکل گیا۔تہمینہ نے اُسے روکنے کی رسمی سی کوشش بھی نہ کی۔

باب نمبر: ۳۴

امریکہ کے اِس بڑے اور صنعتی شہر شکاگو کے لوگوں نے مقامی اخبارات میں چھپی چوتھے درجے کی اِس سرخی پر سرسری سی نظر ڈالی ہوگی اور پھر دوسری خبروں کی طرف متوجہ ہو گئے ہوں گے کہ طیاروں کا کریش ہونا کون سی نئی اور انوکھی بات ہے۔

ڈچ ایرلائنز کا بوئنگ طیارہ سوئزرلینڈ کے قریب حادثے کا شکار ہو گیا۔ طیارے میں موجود 429 چار سو انتیس مسافروں میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا۔

ناشتے کی میز پر بیٹھی اُس نے بھی اِس خبر کو پڑھا۔ گہرے یاس اور دُکھ میں ڈوبی آہ اُس کے سینے سے نکلی اور وہ اپنے آپ سے بولی تھی۔

کیسے بدنصیب تھے۔

جانے کتنی تمناؤں کے ساتھ گھروں سے نکلے ہوں گے؟ پتہ نہیں کس کس کے دل میں ارمانوں کے کیسے کیسے محل سجے ہوں گے؟ حادثے کی یہ خبر کتنے خوش وخرم گھروں پر بجلی بن کر گری ہوگی۔ کتنے معصوم بچوں کی آہیں فضا میں گونجی ہوں گی اور کتنے دلوں کا خون ہوا ہوگا؟

اللہ حادثے کیوں ہوتے ہیں۔ یہ زندگیوں کو روگ کیوں بنا جاتے ہیں؟

وہ اِن دنوں اپنے بھائی کے پاس آئی ہوئی تھی۔ سینٹ لوئس یونیورسٹی سے وہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کوئی چار ماہ قبل یہاں آیا تھا۔ اچھی جاب مل گئی تھی جس فلیٹ میں وہ اِس وقت رہائش پذیر تھا یہ اُس کے کسی گہرے دوست کا تھا جو دو سال کے ایک کنٹریکٹ پر جنوبی امریکہ کے پیرو گیا تھا۔ تین کمروں کا یہ فلیٹ جس کے ایک کمرے میں وہ اپنا ضروری سامان ٹھونس ٹھانس کر بقیہ دو کمرے اُس کے تصرف میں دے گیا تھا۔ شکاگو جیسے شہر میں ایسی

رہائش کا مُفت ملنا کسی نعمت سے کم نہ تھا۔

شاید اسی لئے اُس نے اپنے آنے کے پہلے دن رات کے کھانے پر بھائی سے اُس کی شادی کے بارے میں پوچھا تھا کہ وہ اب تعلیم بھی مکمل کر چکا ہے اور اُس کے پاس گھر کا بندوبست بھی ہے۔ نیز نوکری بھی کر رہا ہے۔

یقیناً اُسے تھوڑی سی حیرت ہوئی تھی کہ امریکہ کے تین سالہ قیام نے اُس کے بھائی پر رتی برابر اثر نہیں ڈالا تھا۔

اُس نے ہنستے ہوئے تنک کر کہا تھا۔

''لو یہ شادی بیچ میں کہاں سے آ گئی۔ وہ تو ہاورڈ یونیورسٹی میں ریسرچ کے لئے جانے کا شدید خواہشمند ہے اور سر توڑ کوشش بھی کر رہا ہے۔ پہلے کیریئر تو بنے۔ شادی تو وہیں پاکستان میں ہوگی۔''

اور وہ بے اختیار اپنے آپ سے بولی تھی۔

''یہ اماں ابا کے باڑے میں اُس جیسی چغد اور ہٹیلی سی بھیڑ کیسے پیدا ہوگئی؟''

اِس وقت وہ اسی فلیٹ کے ڈائننگ روم میں بیٹھی اخبار کی یہ خبر پڑھتے ہوئے افسردگی کی دبیز تہوں میں ڈوبتی جا رہی تھی۔

رات اُسے ڈھنگ کی نیند نہیں آئی اس کا دل بہت پریشان تھا۔

پھر اُس نے گھر کی صفائی کی۔ سپر مارکیٹ سے خریداری کے لئے ٹوکری اٹھائی اور گھر سے نکلی۔ ڈرگ سٹور کے پاس رُک کر کولڈ ڈرنک لی اور تھوڑی دیر وہاں بیٹھی۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ باہر گزار کر وہ سامان سے لدی پھندی گھر آئی۔ فرج بڑی گندی ہو رہی تھی۔ چیزیں رکھنے سے پہلے اُس نے اُس کی صفائی کرنا ضروری سمجھا۔ جب اس سے فارغ ہوئی تو اُس نے کچن میں ہنڈیا چڑھا دی۔

اور عین اُس وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ یہ لندن کی کال تھی۔ اس کی بہن بول رہی تھی اور وہ کہتی تھی۔

''نجمی رحمان آیا تھا۔ مجھ سے امریکہ کا ایڈریس مانگ رہا تھا۔ میں نے اُسے کہہ دیا ہے۔ ہم اپنی عزت کو یوں رُسوائیوں کے منہ میں نہیں دھکیل سکتے۔

وہ گُم سُم ریسیور کانوں سے لگائے ساکت کھڑی تھی۔ تہمینہ شاید اس کا ردِعمل جاننے کی کوشش میں تھی۔ مگر وہ اپنے حواسوں میں ہوتی تب کچھ بولتی۔

تم نے کچھ نہیں کہا۔

وہ اُس سے مخاطب تھی۔

''میں کیا بولوں آپا۔ آپ نے جو کچھ کیا ٹھیک ہی کیا ہوگا؟

ریسیور کریڈل میں رکھتے ہوئے اُس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

تو وہ لندن پہنچا اور میری بہن نے اُسے گھر سے نکال دیا۔

''رحمان تم نے کیا سوچا ہوگا؟ تم کیسے واپس گئے ہوں گے؟ اللہ رحمان میں مر کیوں نہ گئی۔ میرے لئے تم اتنے خوار ہوتے پھر رہے ہو۔''

یک لخت اُسے جہاز کے کریش ہونے کا یاد آیا۔ اور جیسے اس کا کلیجہ کسی نے مٹھی میں بھینچ دیا۔

یہ ضروری تو نہیں کہ وہ واپس ہی چلا گیا ہو۔ لندن میں اس کے بیشمار ملنے والے ہیں۔ یوں بھی وہ ڈچ ایرلائنز سے کبھی سفر نہیں کرتا۔ ہمیشہ پی او اے سی یا پان امریکن کو ترجیح دیتا ہے۔

دھک دھک کرتے دل کو اس نے تسلی کے لفظوں سے بہلانا چاہا۔ پر دل تھا کہ اُڑا جاتا تھا۔ اور کسی طور سمجھنے میں نہ آتا تھا۔ جھک جھک کر ایک خواہش سینے سے لپٹ لپٹ

جاتی تھی۔کہ اُڑ کر ڈھاکہ چلی جائے۔رحمان سے لپٹ جائے۔بچوں کو اپنی چھاتی سے چمٹا لے۔

رات کے کھانے پر بھی وہ بدحواس ہی رہی۔اُلٹی سیدھی حرکتیں کرتی رہی۔سالن کا چمچہ گلاس میں ڈال دیا۔چپاتی روکھی کھانے لگی۔جن کا نوٹس اُس کا بھائی بھی لئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔اُس نے حیرت سے اُسے دیکھا تھا۔

کیا بات ہے؟ نجمی پریشان ہو۔مجھے بتاؤ۔

''ارے نہیں بھیا۔رات سو نہیں سکی۔بس اُس کا اثر ہے۔''

''تم کھانے کے بعد آرام کرو۔شام کو مسز محمود کے ہاں چکر لگا آنا تھا۔بڑی دلچسپ خاتون ہیں۔دل بہل جاتا۔

اور جب وہ اپنے کمرے میں آئی۔اس کا جی دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہا۔اور اُس نے جی بھر کر ایسا کیا۔تھوڑی سی ہلکی ہوئی۔

رات کو اُس نے ثریا اور رازی کو تفصیلی خط لکھا۔اُن سے درد بھری التجا کی کہ وہ رحمان سے مل کر اُسے سارے حالات سے آگاہ کریں۔

"ثریا کیا کروں۔لفظ بھی چھوٹے ہو گئے ہیں۔تنگ پڑ گئے ہیں۔رونا ہی اتنا بڑا ہے کہ سنبھالنے میں نہیں آرہا ہے۔میری بہن نے یقیناً رحمان سے اچھا سلوک نہیں کیا ہوگا۔میری طرف سے منّتی کرنا۔یہ بھی کہنا کہ ایک احمق لڑکی اپنی حماقتوں کی وجہ سے اس کے لئے کس درجہ پریشانیوں اور اذیتوں کا باعث بن گئی ہے۔

خط پوسٹ کر دیا۔ایک دن بعد ٹرنک کال کی کوشش کی مگر رابطہ نہ ہو سکا پورا پاکستان طوفانی ہواؤں کی زد میں تھا اور مواصلاتی نظام درہم برہم تھا۔

یہ وہ دن تھے جب انجانے وسوسے، وہم اور وحشت ناک سوچیں اُسے ہمہ وقت

گھیرے رکھتیں۔وہ سارا دن بیکلی سے گزارتی۔ساری رات عجیب وغریب خواب دیکھتے ہوئے تمام کرتی۔اس کا جی چاہتا کچھ کھالے۔اِس اتنی دردناک زندگی کا خاتمہ کرے۔بھلا اِس روز روز کےمرنے جینے میں رکھا ہی کیا ہے؟

خودکوکوستی۔کیسی منحوس گھڑی تھی؟جب میں اُس سے دور چلی آئی۔پپڑیاں جمے ہونٹوں پرزبان پھیرتی اورکہتی۔

ٹھیک تیرہ دن بعد اُس کواپنے خط کا جواب ملا۔

ثریا نے لکھا تھا۔

''میرا یہ خط تمہارے لئے کسی اچھی خبر کا پیامبر نہیں۔مجھی میری جان مجھے اس کا بےحد افسوس ہے۔لیکن اب اِس کے سوا کوئی اور چارہ کارنہیں کہ تمہیں من وعین حقیقت بتائی جائے۔مجھے احساس ہے کہ تم پردیس میں ہواور ذہنی طور پر شدید پریشان۔تاہم اس کے باوجود میں غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتی اور دلداری کےلفظوں سے بھی تمہیں بہلانے کا اب وقت نہیں۔مجھے تمہاری اوٹگی بوٹگی حرکتوں پر اتنا شدید غصہ کبھی نہیں آیا تھا جتنا اُس دن آیا۔جب میں تمہارا خط لے کرخود رحمان بھائی کے پاس گئی۔بچے مرجھائے ہوئے تھے اور رحمان بھائی سخت پریشان۔یہ جاننے پر کہ یہ تمہارا خط ہے۔بچوں نے کس قدر شور مچایا تھا۔

''ہائے ہماری مما کا خط۔''

خط انہوں نے میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا تھا۔باری باری اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ان کی آنکھوں میں روشنی تھی۔باپ کے گلے میں باہیں ڈال کردونوں بولے تھے۔

''پپا سُنا دیجئے نا۔مما نے کیا لکھا ہے؟''

رحمان بھائی خاموش تھے۔بالکل خاموش۔بچوں کی اس بات پر جب انہوں نے

کوئی توجہ نہ دی تب وہ میری طرف مڑے اور میری ٹھوڑی چھوتے ہوئے بولے۔

آنٹی پلیز سُنا دیں نا۔

میں نے اُنہیں پیار کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی سُناتی ہوں۔''

تبھی لڑکی نے مسکینی سے مجھے دیکھا اور کہا۔

''آنٹی آپ ہماری ماما کو لکھ دیں کہ ہم بہت اُداس ہیں۔ان کے بنا ہمیں کچھ اچھا نہیں لگتا۔خدا کے لئے اب وہ آجائیں یا ہمیں اپنے پاس بلالیں۔''

کیا تم یقین کرو گی۔میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

رحمان بھائی سے تفصیلی باتیں ہوئیں۔

اُنہوں نے بہت سی باتوں کا انکشاف کیا۔اولڈ ڈھاکہ والوں نے جو باتیں کیں ان پر تبصرہ کرتے ہوئے اُن کا کہنا تھا۔

''میں ان ذلیل عورتوں کی گندی ذہنیت پر ماتم کرنے کی بجائے اُس کی عقل پر کیوں نہ ماتم کروں۔جس نے ایسی باتوں پر یقین کیا۔

وہ خاموش ہو گئے تھے۔کمرے میں جان لیوا خاموشی طاری تھی۔انہوں نے سگریٹ سلگایا اور بولے۔

''محبت اور نفرت خلوص اور فریب انسان کا سینہ چیر کر نہیں دیکھے جاسکتے۔سائنس نے بھی ابھی تک کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں کی جس سے اُن کے وجود عدم وجود کا اندازہ لگایا جاسکے۔ہم صرف انسانوں سے مل برت کر ہی سمجھ سکتے ہیں۔جان سکتے ہیں کہ وہ کس معیار کے ہیں؟ مجھے بتاؤ کہ وہ جو میرے اتنے قریب رہی ہے اس کی ریڈنگ میرے بارے میں

ایک قاتل کی ہے۔میں نے اُسے ایک بار نہیں بار ہا بتایا تھا کہ اولڈ ڈھا کہ والیاں کس ذہنیت کی مالک ہیں؟ بھُس میں چنگاری بھر کر تماشا دیکھنا ان کی فطرت ہے۔وہ یہ نہیں جانتی کہ انہوں نے اُس کے بارے میں مجھ سے کیا کہا۔

میری دونوں بھاوجوں اور ان کی رشتہ داروں کا کہنا تھا کہ وہ تو کوئی جادوگرنی ہے جس نے بچوں پر پٹو ڈال لیا ہے،انہیں پوری طرح قابو کرلیا ہے۔بچے تو کسی اور کی طرف دیکھتے ہی نہیں۔خالاؤں تک کو پہچانتے نہیں۔بُہت خطرناک ہے۔جتنی بھولی بھالی صورت ہے اتنی ہی اندر سے مکاّر ہے۔

میں ہنس پڑا تھا۔سکون سے جواب دیا تھا۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔بے لوث پیار اور خلوص سے بھرا انسان واقعی بہت بڑا جادوگر ہے۔

تمہارا خط انہوں نے سارا پڑھا۔تبھی اُن کی آنکھوں میں نمی تھی۔گلوگیر آواز میں صرف اتنا ہی کہہ سکے۔

''ثریا میں اُسے بہت پیار کرتا ہوں۔''

وہیں یہ فیصلہ ہوا کہ وہ لندن جائیں گے اور تمہاری بہن سے بات چیت کے بعد تمہیں لائیں گے۔

تمہاری بہن کے ساتھ اُن کی کیا بات چیت ہوئی؟اس کی تفصیل تو معلوم نہیں ہوسکی۔اب وہ ڈھاکہ پہنچتے تو کچھ معلوم ہوتا۔

شاید ڈچ ایئرلائنز کے بوئنگ طیارے کے کریش ہونے کی خبر تمہاری نظروں سے بھی گذری ہو۔اُس جہاز میں رحمان بھائی بھی سوار تھے چار سو اُنتیس بدنصیب

مسافروں میں سے ایک وہ بھی تھے جن کی لاش کے پرخچے اڑ گئے ۔یہ کیسی موت تھی؟اس موت کی اطلاع جب اُن کے عزیزوں اور رشتہ داروں کو ملی تو ایک کہرام مچ گیا۔ان کا بڑا بھائی فوری طور پر سوئز رلینڈ گیا جہاں حادثہ وقوع پذیر ہوا تھا۔مگر ملتا کیا۔انسانی اجسام کے ٹکرے ٹکرے ہو گئے تھے۔

رحمان بھائی گئے ۔وہ اس جہان فانی سے چلے گئے اور تمہاری زندگی کا ایک المناک باب ختم ہوگیا۔

مگر اب اور سُنو ۔اُن کی انشورنس تمہارے نام ہے معلوم نہیں تمہیں اس بات کا علم ہے یا نہیں ۔وصیت کے مطابق ان کا گلشن والا گھر تمہارے نام ہے۔اب سُنو اُن کے رشتہ دار تمہارے اُس گھر پر آ کر قابض ہو گئے جس کے ایک ایک کمرے کو تم نے سجانے میں بازاروں کے بیس بیس چکر لگائے تھے ۔وہ تو اپنے حسابوں جائیداد کے وارث بن بیٹھے تھے مگران کے وکیل دوست جسے یقیناً تم اچھی طرح جانتی ہو آکر اُن کی غلط فہمی کو دُور کیا۔

اولڈ ڈھاکہ والوں سے لندن جانے سے پہلے ان کی زوردار جنگ ہوئی تھی ۔انہوں نے اپنی بھاوجوں کو لعن طعن کی تھی کہ وہ آخر ایسی شر پسندی کی باتوں سے کب تک لوگوں کے اچھے بھلے بستے رستے گھروں کو جہنم بناتی رہیں گی ۔تمہارے لندن چلے آنے کو انہوں نے چُھپایا۔جہاں آرا آپا نے پوچھا تو صرف اتنا کہا وہ اپنی بہن سے ملنے گئی ہے۔

اب ذرا ان بچوں کا بھی تھوڑا سا احوال سن لو۔جنہوں نے تمہیں پا کر اپنی ماں بھلا دی تھی ۔وہ بچے یوں جُھلس گئے ہیں جیسے بادسموم سے ٹہنیوں پر کھلے گلاب مرجھا جاتے ہیں ۔پھٹی پھٹی آنکھوں سے سبھوں کو دیکھتے ہیں ۔پھر کہتے ہیں۔

''ہماری مما کہاں ہے؟''

جہاں بیٹھتے ہیں وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔جہاں کھڑے ہیں ۔وہیں یتیموں

مسکینوں کی طرح کھڑے رہتے ہیں ۔ان کی خالائیں بھتیرے چونچلے کرتی ہیں ۔بھتیرا بہلاتی ہیں ۔مگراُن پراُس کا کچھ اثر نہیں ۔سنا ہے بچی رات کو تمہارا نام لے کر بُڑبڑاتی ہے ۔

یہ سب باتیں مجھے جہاں آرا آپا سے معلوم ہوئیں ۔وہ حیران ہیں کہ تمہیں ان سب کا علم نہیں میں نے انُہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ان کا کہنا تھا۔کیسی اوندھی لڑکی تھی مجھ سے تو بات کرتی ۔

ایروگرام ہاتھ میں پکڑا تو بیک وقت خوشی اور خوف سے اس کے ہاتھ کانپے تھے ۔لفافہ چاک کیا۔نظریں ڈچ ایئر لائنز طیارے کے کریش تک ہی پہنچی تھیں کہ دلدوز چیخ حلق سے نکلی اور وہ تیورا کر گری ۔گھر خالی تھا۔دیر تک بیہوش پڑی رہی ہوش آیا تو دیوانوں کی طرح اٹھی خط پھر پڑھنا شروع کیا۔وہ ہی سطریں پڑھیں کہ آنسوؤں کا ریلا تھا کہ بہتا چلا آرہا تھا۔نہ آنسوؤں پراختیار نہ تڑپنے پر نہ گریہ زاری پر ۔

تین بجے گھر سے نکل گئی ۔پانچ بجے اس کا بھائی آجاتا تھا۔اوراس حالت میں اس کا سامنا کرنا مشکوک کرنے والی بات تھی ۔شام تک وہ سڑکوں پر کسی لٹے پٹے انسان کی طرح آوارہ گردی کرتی اورخود سے پُوچھتی رہی ۔

میں کب بسی اور کب اجڑ گئی ؟میں کب سہاگن بنی اور کب بیوہ بھی ہوگئی ؟

وہ گھر اُس وقت آئی جب اس کا بھائی کلب چلا گیا۔نیند کی دو گولیاں اُس نے لیں اور غنودگی کے غبار میں گم ہوگئی ۔

صبح اُسے تیز بخار تھا۔سُدھ بدھ نہیں تھی ۔تین دن اسپتال رہی ۔واپس آئی ۔پھر یوں بھی تو ہوتا ہے کہ درد کا حد سے بڑھ جانا بھی دوا بن جاتا ہے ۔

اس انتہا نے اُسے تھوڑی سی واپسی کی طرف لوٹنے میں تقویت دی ۔اپنے بھائی کے اضطراب اور بے چینی کو اس نے ایسا ہو جاتا ہے ۔پریشانی کی کون سی بات ہے؟ کہ کر

ٹالنے کی کوشش کی۔

لیکن اسپتال سے گھر آنے کے دو دن بعد اُس نے بھائی سے لندن بہن کے پاس جانے کی بات کی۔

لندن کی یہ بارش برساتی ایک گہری شام تھی۔اس کی بہن ابھی ابھی اسپتال سے لوٹی تھی۔بغیر کچھ کہے سُنے اُس نے خط اُسے تھما دیا۔وہ پڑھتی رہی اور جب پڑھ کر نظریں اُوپر اٹھائیں۔اُس نے دیکھا تھا۔وہاں جامد سناٹا تھا۔بے رحمی تھی۔خود غرضی کی پھوار سی تھی۔خس کم جہاں پاک والا تاثر نمایاں تھا۔بڑے بپنے تلے لفظ تھے۔دبا دبا سا جارحانہ انداز تھا۔

''مجھی اس باب کو اب بند کردو۔ہمیشہ ہمیشہ کیلئے۔''

اُس نے جھٹکا کھایا تھا۔پہلی بار اپنی بہن اُسے بہت اجنبی اور عجیب سی لگی تھی۔

اُس کا وہ کمزور دبّو اور مجرمانہ سا احساس جو اُسے کوئی بات اعتماد اور ڈٹ کر کہنے سے روکتا تھا۔اس سفّاکانہ رویے پر تلملا اٹھا تھا۔

''آپا آپ نے محبت نہیں کی۔آپ کو کسی نے چاہا بھی نہیں۔آپ کو پتہ ہی نہیں یہ آگ اور اس کا دھواں اِس کی جلن اور اِس کی تڑپ کیسی ہوتی ہے؟ دلوں کا سودا کوئی بار بار ہوتا ہے۔میں تو اس مختصر سے وقت میں محبت کی اس کی فراوانی اور اسکے حُسن میں اتنی بھیگ چکی ہوں۔کہ مزید کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔رہے بچے تو وہ پھول ہیں اور پُھول تو کبھی مرجھانے نہیں چاہیں۔

''مجھے آپ کی تھوڑی سی محبت تھوڑی سی شفقت بس تھوڑا سا تھوڑے سے وقت کیلئے آسرا چاہیے۔میں ڈھاکہ میں نہیں رہ سکتی۔رحمان ہوتا تو اور بات تھی۔وہ دھرتی اب Son of the soil کے نعروں کی زد میں ہے۔بچوں کے ساتھ مجھے یہاں آنا

ہے۔رحمان کے دوست میری نقل مکانی کو ممکن بنائیں گے۔"

اور ڈاکٹر تہمینہ کو تو کچھ کہنے سُننے کا موقعہ ہی نہیں ملا تھا۔

وہ تو تند و تیز ہوا کی طرح آئی تھی اور بگولے کی طرح نکل گئی تھی۔